آشوبِ میکدہ

پروفیسر ڈاکٹر صفدر حسین صفدر

آغازِ نظم

کہاں پر لٹا کاروانِ بہار
گلستاں کا دامن ہوا تار تار
شفق ہے فلک پر بہت سوگوار
اُجاڑا یہ کس نے زمیں کا سنگھار

گلُوں کا ہے زخمی چمن میں بدن
سروں پر ہیں نخلوں کے خونیں کفن
کہاں کی زمیں اور کہاں کا وطن
ہوا سے ہیں محروم سر و سمن

جہاں کا ہے زخمی ابھی انگ انگ
اُڑا ہے زمانے کے چہرے کا رنگ
گلستاں میں جاری ہوئی جب سے جنگ
نہیں عندلیبوں میں کوئی ترنگ

گلستاں میں پھیلا کچھ ایسا فتُور
نہیں امن کا اب کہیں بھی ظہور
سرِ شاخ ہیں گنگ ایسے طیور
کہ جیسے نہیں بولنے کا شعور

پہاڑوں کی ندی اُچھلتی نہیں
سنبھالے سے ہرگز سنبھلتی نہیں

"آشوبِ میکدہ" کا مسودہ نظر سے گزرا، حقائق کا صحیح ادراک رکھتے ہوئے مسائل کی نشاندہی اور بہر کمال دیانت کے ساتھ اُسے پیش کرنے کی کامیاب کوشش پر آپ مبارک باد کے مستحق ہیں "آشوبِ میکدہ" کے سلسلۂ افکار کی روانی کے ساتھ بیان کی سادگی، سلاست اور روانی نے اس کے حُسن میں اور نکھار پیدا کیا ہے۔ ایک تاریخی امانت کو قارئین کے حوالے کرنے والے امین کو ہم نے اپنے گرد و پیش سے کماحقہ باخبر پایا۔

دعا ہے کہ خداوندِ عالم آپ کی توفیقات میں اضافہ فرمائے (آمین) حق و عدالت کے پیروکاروں کی آواز کے ساتھ ہم آہنگ آواز یہی ہے:

ہر اک نقشِ باطل، مٹاتے چلو
زہر ذرّہ طوفاں اٹھاتے چلو
یہ دار فنا ہے بتاتے چلو
سرِ دار بھی دندناتے چلو

سید سراج الدین موسوی
ڈائریکٹر خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران۔ کراچی

کبھی اپنے رستے پہ چلتی نہیں
خم و پیچ سے وہ نکلتی نہیں
کسی سنگ کو وہ ہلاتی نہیں
پہاڑوں میں تیشہ چلاتی نہیں
کسی بوجھ کو وہ اٹھاتی نہیں
مسافر کو اپنے جگاتی نہیں

ہے یوں غمزدہ میکدے کا امام
لبوں پر نہیں اس کے کوئی پیام
یہاں کون کرتا ہے آ کر قیام
کہ منزل ہے کوئی نہ کوئی مقام

نہیں میکدے کی فضا سازگار
تقاضہ نہ کرے کا اب بار بار
ہے تیری نگاہوں میں رقصاں خمار
نہ ہو گا تری لغزشوں کا شمار

نہیں دائمی جب نقوشِ حیات
کہاں تک سنوارے کوئی کائنات
میسر ہے کس کو یہاں پر ثبات
ہمارے مُقدّر میں دن ہے نہ رات

بجاتا نہیں کوئی سازِ ازل
بتاتا نہیں کوئی رازِ ازل

پاکستان کے ممتاز محقق، معروف نقاد
جناب محترم ڈاکٹر اسلم فرخی کی خدمتِ عالیہ میں

ہدیۂ خلوص -

صفدر حسین صفدر　　8.8.93

اُٹھاتا نہیں کوئی نازِ ازل
اُڑے کس طرح شاہبازِ ازل

کس کا کہاں کوئی ہم دوش ہے
کہ پیرِ خرابات خاموش ہے
کوئی میکدے میں نہ مدہوش ہے
نہ سینے میں رکھتا کوئی جوش ہے

زمانے کے تیور ہیں بدلے ہوئے
نگاہوں کے محور ہیں بدلے ہوئے
جدھر دیکھئے گھر ہیں بدلے ہوئے
گھروں کے مُقدّر ہیں بدلے ہوئے

کہاں رہ گئے شیشہ بازِ فرنگ
جو رکھتے تھے ذہنوں میں سوچوں کے ڈھنگ
نہیں اپنے چہرے پہ کوئی بھی رنگ
زمانہ ہوا دیکھ کر ہم کو دنگ

پرانی سیاست ہی مقبول ہے
کہ ذہنوں میں افکار کی دھول ہے
مرے ہاتھ میں وقت کا پھول ہے
اسی موڑ پر کچھ مری بھول ہے

اب انسان انساں سے بیزار ہے
خود اپنے ہی راستے میں دیوار ہے

غلط رَو ہی دنیا میں سردار ہے
صداقت سے کس کو یہاں پیار ہے

مُحبّت کا پیغام جاری نہیں
کہاں دل اُخوّت سے عاری نہیں
مُفکّر سا کوئی مداری نہیں
صداقت کی دیوی ہماری نہیں

نشیمن بہاروں میں جلنے لگے
چمن بھی دوشالے بدلنے لگے
جو منزل کی راہوں پہ چلنے لگے
وہ گرِ گرِ کے آخر سنبھلنے لگے

صلیبوں سے لاشے اُترنے لگے
ستارے زمیں پر بکھرنے لگے
مُقدّر ہمارے سنورنے لگے
ہیں چہرے لہو سے نکھرنے لگے

سرِ طور کوئی نہیں اب کلیم
کہاں کھو گیا ہے زمیں پر ندیم
چمن میں بھٹکنے لگی ہے نسیم
نہیں باغبانوں میں کوئی فہیم

مسلماں زمانے سے روپوش ہے
شبستانِ غفلت میں مدہوش ہے

آشوبِ میکدہ

اِنسانی اُفق پر کربِ آگہی کے نشیب و فراز کی روئیداد

درِ میکدہ پر یہ آیا ہے کون
یہ سوغاتِ آشوب لایا ہے کون

پروفیسر ڈاکٹر صفدر حسین صفدر

خانہ فرہنگ جمہوری اِسلامی ایران
۱۰۸۸-بی خانیوال روڈ ○ ملتان ○ فون: ۳۹۳۴۷

وہ سر گشتۂ بادۂ دوش ہے
خُنک روح، بیگانۂ جوش ہے

کس انداز کا سُن رہے ہیں کلام
مُحبت کا جس میں نہیں ہے پیام
مُباحث تمام اب ہوئے ہیں تمام
چھپے گا کہیں اپنا کالم میں نام

اخُوّت، مُحبتّ روایت نہیں
کسی کو کسی سے ارادت نہیں
کسی گفتگو میں فصاحت نہیں
فصاحت میں کوئی بلاغت نہیں

ہمیں لُوٹتے ہیں فقیہہ و خطیب
ازل سے ہیں خُفتہ ہمارے نصیب
ہوئے آج پیدا یہ کیسے ادیب
بنے ہیں جو اک دوسرے کے رقیب

کہاں اب حقیقت کی مے میں سرور
کہ منطق نے لُوٹا ہمارا شعور
ہوا اپنے ذہنوں میں پیدا فُتور
ہماری خودی ہے سراسر غرور

مرے ذہن میں جتنے جذبات ہیں
وہ بکھرے ہوئے کچھ خیالات ہیں

کتاب کا نام	"آشوب میکدہ"
مصنف کا نام	پروفیسر ڈاکٹر صفدر حسین صفدر، صدر شعبہ فلسفہ، گورنمنٹ کالج بوسن روڈ، ملتان
کمپوزنگ	ہاشمی کمپوزرز اینڈ پرنٹرز، اردو بازار، لاہور۔
سرورق	جالوس
طابع	ندیم یونس پریس
تعداد	ایک ہزار
اشاعت اول	نومبر 1992ء
پروف ریڈنگ	پروفیسر عبدالرزاق شاہد پروفیسر منظور مجاہد
قیمت	۲۲۵ روپے برطانیہ اور یورپ میں پونڈ یا متبادل کرنسی امریکہ اور کینیڈا میں ۹ امریکی ڈالر
ناشر	خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران 1788 بی خانیوال روڈ، ملتان فون: 73934

مُحبتّ میں کیسے مقامات ہیں
جہاں نفرتیں بھی عنایات ہیں
کہاں لُطف مِلنے مِلانے میں اب
کہ دنیا لگی ہے ستانے میں اب
جو ماہر نہیں گھر بسانے میں اب
وہ فنکار ہیں دل جلانے میں اب

عجم کے خیالات بھاتے ہیں اب
عرب کے مناظر دکھاتے ہیں اب
وہ ماضی کا قصّہ سناتے ہیں اب
زمانے کو احمق بناتے ہیں اب

جو کعبے میں ہیں مدتوں سے مکیں
خلوص و وفا ان کے دل میں نہیں
عجم کے خیالات ہیں دل نشیں
پریشاں ہے جس سے حرم کی زمیں

زمانے کا رُستم بھی اب زیر ہے
سمندر پہ بکری بھی اب شیر ہے
جہاں کے بکھرنے میں کچھ دیر ہے
یہ انساں نہیں خاک کا ڈھیر ہے

یہ منظر بہت ہی المناک ہے
کہ ساقی کا دامن بھی اب چاک ہے

انتساب

رہبر کبیر انقلابِ اسلامی و بنیان گزارِ جمہوری
اسلامی ایران اور ملّتِ اسلامیہ کے
بہی خواہ حضرت آیت اللہ العظمیٰ امام خمینی قدس سرہ
کے نام

یہ ہے انتساب اُس خمینی کے نام
جو ہے علم و حکمت میں سب کا امام

سروں پر ہمارے فقط خاک ہے
یہ کیسا دھواں زیرِ افلاک ہے
کوئی دور ساقی چلاتا نہیں
شرابِ نظر وہ پلاتا نہیں
وہ چہرے سے پردہ اٹھاتا نہیں
سرِ بزم جلوہ دکھاتا نہیں

محبت کا شعلہ بہت سرد ہے
حسینوں کا چہرہ بھی اب زرد ہے
حقائق کے چہرے پہ بھی گرد ہے
مفکّر بھی بیگانۂ درد ہے
گلستاں میں کیا کوئی صیاد ہے
نشیمن نشیمن جو برباد ہے
حرم کی حسینہ بھی آزاد ہے
ہوس کاریوں کا جہاں شاد ہے

سرِ کعبہ کوئی بھی سر خم نہیں
زمیں میں ہماری کوئی نم نہیں
کسی کو کسی کا یہاں غم نہیں
نفس میں ہمارے کوئی دم نہیں
نہ ایثار کی ہم میں توفیق ہے
نہ ہم میں کوئی مثلِ صدیق ہے

کیا ہے خمینی کو جو انتساب
چکایا زمانے کا میں نے حساب

جو قابو میں رکھی قلم کی لگام
حدیثِ وفا ہے مری اب تمام

خمینی تھا وہ ایک بطلِ جلیل
کہ مظلوم دنیا کا تھا وہ وکیل

وہ ایراں میں تھا ایسا مردِ خلیل
کیا جس نے مغرب کو بڑھ کر ذلیل

جو تھا علم میں اپنے روشن دلیل
وہ رکھتا تھا کچھ ایسی فکرِ جمیل

خمینی تھا اُمتّ کا ایسا امام
کہ بدلا تھا جس نے جہاں کا نظام

کیا یہ خمینی نے بے مثل کام
تھا لوگوں کے ہاتھوں میں وحدت کا جام

جو اقوامِ مغرب پہ غالب رہا
وہ باطن کا مشرق کے قالب رہا

خمینی ہے مِلتّ کی آنکھوں کا نور
زمانے کو اس نے دیا تھا شعور

خمینی کا دُنیا میں تھا یہ کمال
ہوا شاہ کا اُس کے ہاتھوں زوال

نہ دل سے محبّت کی تصدیق ہے
نہ اپنے مسائل پہ تحقیق ہے

نہ جذبہ کوئی دل میں بیدار ہے
خوشامد کا دھرتی پہ دربار ہے
ثقافت سے بھی اپنی انکار ہے
یہ رُسوائی کا گرم بازار ہے

فلک پر ہمارے ستارے نہ دیکھ
گلُوں کے زمیں پر نظارے نہ دیکھ
سمندر کے اپنے کنارے نہ دیکھ
مصائب میں اپنے سہارے نہ دیکھ

ہوئے کب سے بیکار قلب و نظر
غزل میں نہیں کوئی سوز و اثر
میسّر نہیں آج لوگوں کو گھر
نہیں راستے میں کوئی اب شجر

انا کے سمندر میں گرداب ہے
چکوری کے چکرّ ہیں مہتاب ہے
ہر اک شخص دُنیا میں بیتاب ہے
زمانے میں انسان نایاب ہے

پنہ مانگتی ہے زمیں پر حیات
ہے زیر و زبر آج کُل کائنات

خمینی کا مِلّت کو تھا یہ پیام
کہ آپس میں رکھو دعا وَ سلام

خزاؤں کے سائے بھی ڈھل جائیں گے
فلک کے یہ تیور بدل جائیں گے

ہے فکرِ خمینی جو پیشِ نظر
نہ مغرب کا ہوگا کسی پر اثر

نظر میں زمانے کے ہیں انقلاب
دیا جائے حکمت سے اُن کا جواب

ہر اک کو جہالت کرے گی ذلیل
نہ ہوگا کوئی بھی تمہارا وکیل

جھکاؤ محمدؐ کے در پر جبیں
مُقدّر تمہارا رہے گا حسیں

نہ آئے گی ایراں میں ظُلمت کی شام
سحر کا رہے گا یہاں پر قیام

خمینی مُفکّر تھا اسلام کا
وہ زیرِ فلک تھا بڑے کام کا

عجب ہی خمینی کے افکار ہیں
کہ حکمت سے ہم ان کی سرشار ہیں

جو آئے گا اُن سے یہاں انقلاب
نہ ہوگا زمانے میں اُس کا جواب

تغیّر میں رہتے ہیں دن اور رات
میسّر نہیں ہے کسی کو ثبات

نہیں ہے شرر کوئی پتھّر میں آج
کہاں خون کا رنگ ساغر میں آج
ہیں بے خوابیاں دیدۂ تر میں آج
نہیں کچھ ہمارے مقدّر میں آج

زمانے کا محمود ہے بے نیاز
کہاں اس کی آنکھوں میں حُسن ایاز
سخن میں نہیں کوئی سوز و گداز
غزل میں بھی ملتا نہیں رنگِ ناز

نظر سے تہی دامنِ جستجو
نہیں دل میں باقی کوئی آرزو
نہ آنکھوں میں آنسو نہ دل میں لہو
نمازی کریں آج کیسے وضو

تکلّف پہ ہے زندگی کا مدار
اسی طرح چلتا ہے یہ کاروبار
مرا جسم ہے آرزو کا مزار
نہیں روح کو اب میسّر قرار

گلی میں برہنہ ہے رقصِ حیات
لُٹی چاندنی میں ہماری برات

یہی ہے محبت یہی ہے وفا
کریں مل کے ہم یہ فریضہ ادا
خمینی نے بخشا ہے جو اعتماد
تقاضا ہے اس کا کریں ہم جہاد
بنے ہیں خمینی کے جو جانشیں
وہ ہیں تیرگی میں خرد راہ بیں
دلوں میں جو رکھتے ہیں صدق و یقیں
ہیں ایراں میں وہ آج روشن جبیں
نگاہوں کے ترکش ہیں جن کے حسیں
ہر اک تیر ان کا بڑا دل نشیں
جو رکھتے ہیں سینے میں خُلقِ عظیم
لرزتے ہیں اُن سے ہمارے غنیم
ہیں روحانیت میں جو سب کے امام
قیادت میں اُن کی رہیں گے عوام
علی خامنہ[1] ای ہے ملّت کا چاند
نہ ہوگی کبھی روشنی اس کی ماند
علی خامنہ ای ہے وہ مردِ حُر
کہ جینے کے جس نے سکھائے ہیں گُر

۱۔ ولی امر المسلمین آیت اللہ العظمیٰ علی خامنہ ای

قیامت کی مانند گزری ہے رات
محلِّ نظر ہے ابھی دن کی بات

ملا شہر میں ہم کو جو راہگیر
زر و سیم کا اُس کو پایا اسیر
صنم در بغل ہے حرم کا امیر
شریعت کے ماتھے پہ کالی لکیر

سرِ بزم محشر اُٹھایا گیا
برہنہ حسینوں کو لایا گیا
مروّت کا لاشہ جلایا گیا
اور انساں کو حیواں بنایا گیا

بناؤ محبّت کو جزوِ حیات
نکلتی ہے یوں ارتقاء کی زکات
عدم ہے وجود اور ہستی ثبات
علامت بنی ہے گناہوں کی رات

نہیں جس کی دُنیا میں کوئی حدود
ملے ہیں اِسی سے ہمیں ہست و بود
اِسی سے ہے باقی ہمارا وجود
ہوئی ہے خودی سے ہماری نمود

عناصر کا خالق ہے گرچہ خدا
بدلتی ہے اُن کو ہماری دعا

صدر ہاشمی[1] ہے جو ایران کا
نگہباں ہے وہ آج انسان کا

نہیں کوئی قریہ یہاں بے اذاں
ہیں سجدے میں صفدر زمیں آسماں

چلایا ہے جس نے خودی کا نظام
ہے ایراں میں اس کا بڑا احترام

ہیں جس کی غلامی میں اب تخت و تاج
دلوں پر ہے اس کی محبت کا راج

ہے نظمِ حکومت کا جو اعتبار
جہاں میں ہے ایراں کا اُس سے وقار

ہے تقریر پر جس کی دنیا نثار
مُحبّت، اُخوّت کا ہے وہ سنگھار

بصیرت پہ جس کے ہے دار و مدار
حکومت کا اس پر ہے اب انحصار

جہاں میں سخاوت ہے جس کا شعار
غریبوں کو مِلتا ہے اس سے قرار

مُفسّر ہیں جو دین و افکار کے
مُحافظ ہیں وہ سب کی دستار کے

1۔ علی اکبر ہاشمی رفسنجانی صدر اسلامی جمہوری ایران

ہر اک شے میں رقصاں ہے اس کی ادا
نفس کی ہے رفتار مثلِ ہوا

اجل زندگی کی طرفدار ہے
کہ جنت سے شدّاد بیزار ہے
جو آشوب کا اپنے غمخوار ہے
مصیبت کا اپنی وہ شہکار ہے

ہے کثرت میں توحیدِ حق کا ظہور
ملا زندگی کو یہاں سے شعور
اسی میں ہے شانِ خدا کا ظہور
بنا دے وہ ظلمت کو آنکھوں کا نور

تراشے ہیں خواہش نے یہ سومنات
زمیں پر ہیں اپنے یہی شش جہات
درِ شام پر اب سوالی ہے رات
ہے دستِ اجل میں کھلونا حیات

یہ صحرا ہے لیکن یہاں لُو نہیں
گلستاں میں اپنے کوئی بُو نہیں
فرشتوں میں انسان کی خوُ نہیں
یہاں میں کہاں ہوں اگر توُ نہیں

طوائف ہوئی آج خلوت نشیں
ثقافت ہے اب انجمن آفریں

خمینی کا تھا موسوی[1] جو مرید
یہودی کے ہاتھوں ہوا وہ شہید

لبوں پر تھے جس کے کبھی پنج تن
اُسی کے لہو سے ہے رنگِ چمن

مِلا ہے شہادت کا رُتبہ اُسے
ملی کامرانئِ عُقبیٰ اُسے

جو روح و بدن کا یہ آہنگ ہے
گلستانِ ہستی لہو رنگ ہے

وہ لبنان میں ہے جہاں محو خواب
وہاں ہے لہو میں ابھی پیچ و تاب

جو ٹھہرا تھا مرد خدا کی دلیل
وہ صحرا میں تھا اِک ہجومِ نخیل

کیا جس نے اخلاص پر انحصار
اسی کا ہوا دہر میں اعتبار

جو مردِ مجاہد تھا عارف[2] یہاں
تھا دینِ مبیں کا وہ عالم جواں

حسین الحسینی تھا وہ مرد حق
ہوا جس سے سینہ اجل کا بھی شق

1۔ سید عباس موسوی شہید حزب اللہ کے سربراہ (لبنان)

2۔ شہید عارف الحسینی

ٹھٹھرتی ہے عصمت کی میّت کہیں
سرِ دار تطہیرِ مریم نہیں

فلک پر کوئی بھی ستارہ نہیں
کوئی اشک مثلِ شرارہ نہیں
ترا چہرہ پڑھنے کا یارا نہیں
اگرچہ یہ قرآں کا پارا نہیں

خدا ہی خدا ہے یہاں جلوہ گر
مری دسترس میں نہیں بحر و بر
خمیدہ ہے وحدت کی چوکھٹ پہ سر
محبّت کی ڈالو کوئی اب نظر

ترے در پہ آ کر ہوئی مجھ سے بھول
کہ رقصاں تھی آنکھوں میں باطل کی دھول
لگائے ہیں صحرا کے دامن پہ پھول
گلستاں میں ہم کو ملے ہیں ببول

بڑھایا ہے فرعون کا اب غرور
جلایا ہے لوگوں نے موسیٰ کا طور
نہیں ہے میسّر مسلماں کو حور
یہ آتش کدہ تھا کبھی کوہِ نور

نہیں ایک مدّت سے اہلِ فرنگ
نہ بدلا ہمارے تمدّن کا رنگ

شہیدِ وفا ہے وہ ہر حال میں
کمی کچھ نہیں قتیل اور قتال میں

فلک جن شہیدوں پہ ہے اشک بار
ہوا مہرباں ان پہ پروردگار

ہے فکرِ خمینی جو ظُلمت میں نور
تو دنیا میں ہوگا اُسی کا ظہور

جو انسانیت کا رہا خیر خواہ
ہر اک پر تھی اس کی کرم کی نگاہ

ہیں ہمت میں شاہین، جُرأت میں باز
کُھلے ہیں زمانے کے اب ہم پر راز

ہے فکرِ خمینی کا گر سر پہ تاج
مسلماں کریں گے زمانے پہ راج

خیالات میں ہے تذبذب کا زنگ
نہ کرنا تعصّب کی آپس میں جنگ

یہ اُمت ہوئی اپنے مرکز سے دُور
نہ ہو کس طرح دہر میں نا صبور
نہ وجدان میں ہے کوئی اب سرور
مصیبت بنا جا رہا ہے شعور

میسّر ہے کس کو سکون و ثبات
بدلتی رہے گی لبادہ حیات
مکمّل نہیں ہے ابھی کائنات
ابھی رقص کرتے ہیں لات و منات

مکمّل نہیں ہے ہمارا وجود
ابھی درمیاں ہیں خودی کی حدود
تکلّف ہے دنیا میں ذوقِ سجود
غرض بندگی کی ہے نام و نمود

تری زندگی بھی کوئی ساز ہے
ضمیروں کے گنبد میں آواز ہے
تری خاک میں ذوقِ پرواز ہے
خدا کا زمانے میں تو راز ہے

سرِ آسماں اُس نے پھینکی کمند
ہے انسان دنیا میں سب سے بلند

اسے اپنے ہاتھوں سے پہنچا گزند
اسے کشمکش ہے ہمیشہ پسند
حقیقت ہے اس کی برنگِ مجاز
کہ توڑا ہے اس نے محبّت کا ساز
عجب ہیں عجب اس کے ناز و نیاز
ہے گاہے وہ محمود گاہے ایاز

اسے امن میں کوئی راحت نہیں
کسی فکر میں اس کی لذّت نہیں
لہو میں ہمارے حرارت نہیں
بزرگوں کی درپیش عظمت نہیں
ہر اک چیز مخفی تھی آیات میں
عمل کا تھا نقشہ مکافات میں
ہوا رقص ناگن کا پھر رات میں
رہی صبح تک وہ کسی گھات میں

تھی صحنِ اجل میں کبھی زندگی
اتر آئی آنکھوں میں پھر روشنی
گناہوں کا پردہ رہی تیرگی
تھی بے چین کب سے چمن میں کلی
نظر میں کوئی جستجو تھی نہ اَوج
سمندر کے طوفاں میں تھی کوئی مَوج

آئینۂ ترتیب

نمبر شمار	عنوان		صفحہ

بنی خواہشوں کی کوئی دل میں فوج
ہوئی خیر و شر سے کوئی زوج زوج

جو شانوں سے پتّے اُترتے رہے
اُتر کر زمیں پر بکھرتے رہے
جہاں جانور آ کے چرتے رہے
مقدّر بھی ان کے سنورتے رہے

خودی کو نہ سمجھو کبھی بے ثبات
بناتی رہے گی یہ نقشِ حیات
اترتی ہے در پر اسی کے برات
افق پر اُسی کے بدلتی ہے رات

متاعِ بیاباں ہیں گو خار و خس
نتائج ہیں اس کے مگر دوررس
اگرچہ شکستہ ہے تارِ نفس
مگر اپنے دل میں ہے پھر بھی ہوس

زمانے میں انسان بدنام ہے
فرشتوں کے لب پر مرا نام ہے
کبھی صبح ہے اور کبھی شام ہے
زمانہ گرفتارِ ایام ہے

ہر اک سانس سینے میں تلوار ہے
کہ عیسیٰ بھی اپنا سرِدار ہے

مقدمہ

"شوبِ میکدہ" ایک طویل نظم ہے۔ ہر چند کہ بیسویں صدی میں طویل نظم لکھنے کی روایت کو چنداں اہمیت نہیں ملی۔ لیکن بہت سے شاعروں نے فنی پختگی حاصل کرنے اور شعور کی اہمیّت کو سمجھنے کے بعد طویل نظم کو ذریعۂ اظہار بنانے کی کامیاب کوششیں ضرور کیں۔ طویل نظم کی معروف ترین صورت رزمیہ مثنوی تھی۔ برِصغیر میں ماضی قریب میں ایسے بہت کم واقعات رونما ہوئے جو کسی بڑی رزمیہ مثنوی کی تخلیق کا محرک بن سکتے۔ قیامِ پاکستان ایک بہت بڑا واقعہ تھا لیکن اس کی بنیاد رزم سے زیادہ فکر اور پُر امن جدوجہد پر تھی۔

برصغیر کے مسلمانوں کے ہاں رزمیہ کی جگہ ایک حد تک مرثیے کو حاصل رہی اردو کے بیشتر مرثیے طویل ہیں اور رزمیہ مثنوی کے مزاج کے حامل ہیں۔ کوئی بھی باقاعدہ رزمیہ مثنوی تخلیق نہ ہوسکنے کے اسباب واضح ہیں۔ لیکن طویل نظم لکھنے کی آرزو بیشتر شعرا کو رہی ہے اور انہوں نے اس آرزو کی تکمیل کے لئے ماضی میں اقبال سے پہلے عشقیہ مثنویاں لکھیں۔ لیکن جدید دور میں طویل نظم کی تخلیق کی خواہش رکھنے کے باوجود شعرا نے عشقیہ مثنوی کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ دوسری زبانوں میں یہ صورت حال موجود رہی ہے۔ انگریزی میں تو "چاسر" اور "گوور" سے لے کر "ٹی ایس ایلیٹ" تک طویل نظم کی روایت جاری رہی ہے۔ وکٹورین عہد میں میتھو آرنلڈ ایسے معروف شاعر کو بھی مسلسل یہ احساس رہا کہ اگر اس نے طویل نظم نہ لکھی تو اس کی شاعرانہ حیثیت مُسلّم نہ ہو سکے گی۔ ہر چند کہ وہ مختصر لازوال نظمیں تخلیق کرچکا تھا "EMPEDOCES ON ETRA" اور بعد میں "سکالر جپسی" ایسی نظمیں سامنے آئیں جو طویل نظموں کی فہرست میں شامل نہ کی جاسکیں تو بھی وہ نظمیں عام معانی میں مختصر بھی نہیں تھیں۔ یہ دونوں نظمیں اس کی طویل نظم لکھنے کی خواہش کا واضح اظہار تھیں۔ اس نے بالآخر رستم و سہراب کی داستان کو انگریزی میں طویل نظم لکھنے کے لئے منتخب کیا اور ایک طویل نظم مثنوی کے انداز میں لکھی۔ یہ نظم اس لئے ناکام رہی کہ رستم و سہراب کی داستان سے انگریزوں کا کوئی جذباتی تعلق نہیں تھا۔ رزمیہ مثنوی کی تخلیق کے لئے لازم ہے کہ واقعات اور افراد قومی سطح پر لوگوں کے دل و دماغ میں بس جانے کی اہلیت رکھتے ہوں۔

یونان، اٹلی، برصغیر وغیرہ کا قدیم شعری سرمایہ بھی زیادہ تر طویل نظم بالخصوص رزمیہ مثنوی کی صورت میں ہی محفوظ ہے۔ ہمارے ہاں رزمیہ مثنوی لکھنے کی خواہش ضرور موجود رہی ہے لیکن کوئی شاعر لکھ نہیں سکا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ شروع ہوئی تو قوم میں جو جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ اس سے اور فوجیوں کے اپنے جذبے کی وجہ سے میں نے محسوس کیا کہ شاید پاکستان کی ایپک ایج EPIC AGE کا آغاز ہوگیا ہے۔ توقع تھی کہ اس جنگ کے بعد فیلڈ مارشل ایوب خان اور کچھ بہادر فوجی ایسے قومی ہیرو بن کر ابھریں گے جو

جو بندہ خدا کا گنہگار ہے
وہ اپنی خودی سے بھی بیزار ہے

خودی ہے زمانے میں رازِ حیات
ہے بیدار جس سے تری کائنات
اُجاڑے گئے ہیں کئی سومنات
زمانے نے دیکھی خدا ہی کی ذات

کیا ہے لہو کو جو بوتل میں بند
نہیں یہ بھی فطرت میں خلوت پسند
کوئی پست ہے اور کوئی بلند
مگر سب کو پہنچا فلک سے گزند

سروں پر پڑی آج قدموں کی خاک
بڑھا جس سے انساں کا اور انہماک
لہو نے کیا دامنِ دل کو پاک
چمن کا گریباں ہوا چاک چاک

ہمیشہ رہی ہے لحد سامنے
بتاتے ہیں ہم کو ابد سامنے
زمانے میں ہے نیک و بد سامنے
رہی ہے مگر اپنی حد سامنے

خودی بھی خدا بن کے رہتی نہیں
کوئی زخم دنیا کا سہتی نہیں

پاکستان میں رزمیہ مثنویوں کا موضوع آسانی سے بن سکتی تھی۔ اس زمانے میں قومی بہادری اور جنگ کے
حوالے سے بے شمار مختصر نظمیں تخلیق ہوئیں لیکن (EPIC STATURE) والی تخلیق سامنے نہیں آئی۔
وجہ یہ تھی کہ اس جنگ نے قوم کو کوئی ایسا ہیرو دیا نہ کوئی ایسا کارنامہ جو رزمیہ مثنوی کی تخلیق کا
محرک بن سکتا۔ خود میں نے بھی انگریزی میں ایک مضمون (THE BEGINNING OF
PAKISTAN'S EPIC AGE) لکھنا شروع کیا۔ لیکن جنگ جس انداز میں ختم ہوئی اس کی وجہ سے کام
سرد پڑ گیا۔ باقاعدہ جنگیں اس کے بعد بھی ہوئیں اور سرد جنگ تو مسلسل جاری ہے اور بعض بہادروں کے
نام بھی سامنے آئے لیکن (EPIC STATURE) رزمیہ قد و قامت کا نہ کوئی ہیرو سامنے آیا نہ کوئی واقعہ
رونما ہوا۔ قائداعظم، تحریکِ پاکستان کے حوالے سے یقیناً رزمیہ قد و قامت کے حامل ہیں۔ لیکن ان کا
میدان عام جنگ والا میدان نہیں تھا۔ وہ جس فکری بلندی کے حامل تھے اس کو موضوع بنا کر مثنوی تخلیق
کرنے کا حوصلہ ابھی تک کسی کو نہیں ہوا۔ ہمارے ہاں بدقسمتی سے زیادہ عرصہ آمریت رہی ہے زیادہ لوگ
اس آمریت کو پسند نہیں کرتے رہے اور سرد جنگ کی حالت میں ایک رزمیہ صورت حال اور ذہنوں میں
مسلسل جاری ہے اور یہی وہ صورت ہے جو آج فکری رزمیہ مثنوی کی محرک بن سکتی ہے۔ اس طرح کی
روایت اردو شاعری میں خاصی توانا ہے۔

مسدسِ حالی کو پہلی قومی فکری مثنوی کا درجہ حاصل ہے۔ اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی نے کہا ہے
کہ خواجہ حالی اردو کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے مثنوی میں اخلاقی، قومی اور سیاسی مسائل بھی بیان کیے۔
حفیظ جالندھری کے شاہنامہ اسلام کو بھی ایک فکری مثنوی کی حیثیت میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس روایت کو
اقبال نے مستحکم کیا قیامِ پاکستان کے بعد رزمیہ مثنوی کی تخلیق باوجود توقع کے نہ ہو سکی اور فکری مثنوی کی
روایت کسی حد تک قائم اور جاری رہی۔ عرصہ تک یہ روایت مختصر نظم کی روایت کے تحت بنی رہی۔

ترقی پسند شاعروں نے طویل نظم سے عموماً گریز کیا۔ حلقہ اربابِ ذوق سے متعلق شعراء نے بھی مختصر
نظم ہی کو ترجیح دیے رکھی، لگتا تھا کہ حفیظ جالندھری اور اقبال کے بعد باقاعدہ مثنوی بحر میں لکھی جانے والی
طویل نظم بالخصوص فکری مثنوی کی تخلیق رک گئی ہے۔ کیونکہ پاکستان میں بعد میں طویل نظم کے لیے آزاد
شاعری کا اسلوب زیادہ استعمال ہوا ہے۔ ن۔ م راشد اور جعفر طاہر نے آزاد شاعری میں طویل نظم لکھنے کی
روایت کو جو استحکام بخشا اس نے ڈاکٹر وزیر آغا کو طویل نظم لکھنے کا حوصلہ دیا اور ڈاکٹر وزیر آغا نے آزاد
نظم کے اسلوب میں دو طویل نظمیں "آدھی صدی کے بعد" اور "اک کتھا انوکھی" اردو ادب کو دیں۔ میں
سمجھتا ہوں کہ ن۔ م راشد، جعفر طاہر اور وزیر آغا کی طویل نظموں کو آزاد شاعری کی فکری مثنویاں قرار دیا
جاسکتا ہے۔ آج بحر کی تخصیص کا مسئلہ زیادہ اہم نہیں رہا پھر ہمیں یہ حقیقت بھی سامنے رکھنی چاہیے کہ
ہماری آزاد شاعری مصرعوں کو گفتگو کے وقفوں کے مطابق ترتیب ضرور دیتی ہے لیکن بحر کوئی نہ کوئی نظم کی
بنیاد میں موجود ضرور رہتی ہے اور یہ بحر ان سات بحروں سے الگ نہیں ہوتی۔ جن میں عام طور سے

سمندر کی لہروں میں بہتی نہیں
کسی سے کوئی بات کہتی نہیں

حقائق کی راہیں بدلنے لگیں
ہوائیں جہالت کی چھٹنے لگیں
گلستاں میں کلیاں چٹخنے لگیں
ذہن سے اجالے اگلنے لگیں

کسی بات کی اب گرانی نہیں
سمندر میں کوئی روانی نہیں
جو دنیا میں حسرت کی بانی نہیں
مرے دور کی وہ جوانی نہیں

کسی بات کا اب نہ غماز ہے
نہ تقویم کا اب کوئی راز ہے
شکستہ دلِ زار کا ساز ہے
نہ لب پر کوئی نغمۂ ناز ہے

نشے میں ہے ڈوبا ہوا انگ انگ
بدستور ہے میکشوں کی ترنگ
ضمیروں میں جاری ہوئی آج جنگ
لہو کا ہے پھیکا سا ساغر میں رنگ

نہ لے کام تُو اب پس و پیش سے
قیامت نہ ہو گی کم و بیش سے

مثنویاں لکھی جاتی رہی ہیں۔ اگر کسی شاعر نے کوئی اور بحر اختیار کی ہو تو اس کا جواز بھی موجود ہے۔ یعنی اگر سات بحروں میں مثنوی لکھی جاسکتی ہے تو آٹھ میں کیوں نہیں۔ خود میر تقی میرؔ نے کئی بحریں استعمال کی ہیں۔ گلزار نسیم کی بحر مجھے کچھ مشکل معلوم ہوتی ہے۔ فعولن' فعولن' فعولن' فعل یا فعولن چار بار والی بحر کا استعمال قدرے آسان معلوم ہوتا ہے۔ یہ بحر بہت سے شعرا نے استعمال کی ہے میرؔ کی کئی مثنویاں اسی بحر میں ہیں۔ مسدسِ حالی کی بھی یہی بحر ہے اور اقبال کی "ساقی نامہ" کی بھی۔ ن۔ م راشد کی "حسن کوزہ گر" کی بھی یہی بحر ہے۔ وزیر آغا کی نظم "آدھی صدی کے بعد" کی بحر گرچہ فاعلن کی تکرار سے بنتی ہے لیکن یہ بحر فعولن کی تکرار والی بحر کے بہت قریب ہے اور اگر صرف ایک پہلے رکن کو نظرانداز کر دیا جائے تو ساری نظم فعولن میں نظر آنے لگتی ہے۔ فعولن اور فاعلن کی تکرار آزاد نظم میں بطور خاص روانی اور آسانی پیدا کرتی ہے۔ جبکہ باقاعدہ مکمل بحر والی نظم میں اس کا تاثر پہلے سے مسلم ہے۔ فعولن' فعولن' فعولن' فعل کی بحر کے فکری مثنوی کے لئے استعمال کی تازہ ترین مثال ڈاکٹر صفدر حسین صفدر کی طویل نظم "آشوبِ میکدہ" آج میرے پیشِ نظر ہے۔ یہ نظم گزشتہ بہت سے برسوں میں لکھی جانے والی طویل ترین فکری مثنوی ہے اور اس کا براہ راست تعلق اس روایت سے زیادہ قریبی ہے جسے حالی' حفیظ جالندھری اور اقبال نے مستحکم کیا تھا۔ کیونکہ ان تمام شعرا نے بحر کو مکمل شکل میں مصرعوں میں استعمال کیا۔

اردو مرثیے کے بارے میں مَیں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے مرثیے کو رزمیہ مثنوی کی قد و قامت اور مزاج کا حامل بنا دیا تھا اور یہ روایت جاری ہے۔

بحر سے تعرض نہ کیا جائے تو قصیدے نے بھی ایک حد تک مثنوی کی کمی کم از کم فکری میدان میں پوری کرنے میں معاونت کی ہے۔ اقبال کا قصیدہ بہ اتباعِ سنائی ایک عمدہ مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ پاکستان میں طویل فکری نظم غالباً" سب سے زیادہ عبدالعزیز خالد نے لکھی ہے۔ لیکن اسلوب اور تکنیک انہوں نے مثنوی کا استعمال نہیں کیا۔ غزل کا کیا ہے جیسا کہ اقبال نے بھی کیا ہے۔ بحیثیت مجموعی طویل نظم کی تخلیق کی تاریخ اور روایت میں عبدالعزیز خالد کا حصہ بیسویں صدی کے تمام شاعروں سے زیادہ رہا ہے اسلوب اور روایت سے قطع نظر عبدالعزیز خالد کی شاعری کے ایک اہم حصے کی فکری سطح جدید فکری مثنوی کے مزاج کے قریب نظر آتی ہے لیکن تمام اشعار کے مطلعوں کی صورت میں ہونے کی شرط ایک بہت بڑی شرط ہے تاہم اگر ن۔ م۔ راشد' جعفر طاہر اور وزیر آغا کی آزاد نظم کو جدید فکری مثنوی کہا جاسکتا ہے تو عبدالعزیز خالد کی بہت سی نظموں کو بھی اس پہلو سے دیکھا جاسکتا ہے۔ پھر بعض نعتیہ قصائد مثلاً" خالد احمد کا نعتیہ قصیدہ بھی اسی زُمرے میں آجائے گا۔ یہ بیان جو میں نے دیا ہے کہ "ن۔ م۔ راشد' جعفر طاہر اور وزیر آغا کی طویل فکری نظموں کو مثنوی کا متبادل سمجھا جائے" بحث سے کھلا ہے اور صاحب الرائے دانشوروں کی آراء کی روشنی میں اس بیان کو دیکھا جائے گا۔

یہ روایت بہر حال مقبول ہو رہی ہے اور حال ہی میں ڈاکٹر محمد امین نے ایک طویل فکری نظم "آدم

نگاہیں نہ بدلو کبھی خویش سے
نہ نفرت کرو اپنے درویش سے
خودی کا نشیمن جلایا گیا
عقیدت کے مرکز کو ڈھایا گیا
جو نغمہ حقیقت کا گایا گیا
ہر اک رنگ میں وہ سُنایا گیا

ازل سے ہے دنیا اسی میں اسیر
ہیں زنداں بدن میں ہمارے ضمیر
لُٹیرے ہوئے جب سے دنیا میں پیر
ندامت کے ماتھے پہ آئی لکیر
خودی کے نگہباں کہاں کھو گئے
کہاں پر یہ اہلِ حرم سو گئے
نگاہوں سے اوجھل وہ یوں ہو گئے
نہ آئے کبھی لوٹ کر جو گئے

نہیں شہر میں اب کوئی ارجمند
نہ بازار میں کوئی گردن بلند
تخیّل کی جو پھینکتا ہے کمند
وہ رکھتا ہے شاعر پہ دروازہ بند
یہاں کوئی کرتا نہیں درگزر
کہ فرعون لگتا ہے اب ہر بشر

اور جنت ہوا میں ایک مقالہ" کے نام سے ایک نظم کی صورت میں لکھی ہے۔ شبنم رومانی نے یہ طویل نظم، مثمّن بحر میں "مثنوی سیر کراچی" کے نام سے لکھی اور شائع کی تھی۔ یہ ایک خوبصورت نظم تھی جو ہر چند کہ انہی تک محدود رہا۔ ادب کے سنجیدہ قاریوں کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ شبنم رومانی نے اپنے مثنوی کی بلندیوں سے اتر کر عام دلچسپی کے موضوع پر مثنوی تخلیق کی تھی۔ ان کا مقصد پوپ کی MOCK EPIC مزاحیہ مثنوی RAPE OF THE LOCK سے نہیں ملتا جلتا ہے۔ یہ مثنوی MOCK ہونے کے باوجود مزاحیہ MOCK نہیں ہے۔ شبنم رومانی نے ... سے بھی انکار نہیں کیا۔ تاہم انہوں نے مثنوی کی حدود کو جو وسعت دی ہے وہ نئے امکانات کی نشاندہی ضرور کرتی ہے۔

ڈاکٹر صفدر حسین صفدر کی "آشوب نیمدہ" کے بارے میں دو آراء نہیں ہو سکتیں۔ یہ نظم مثنوی کی تمام تر شرائط پوری کرتی ہے۔ ہر چند کہ نظم کی بنیاد کسی باقاعدہ جنگ پر نہیں رکھی گئی۔ نظم میں اقدار کے مابین اور وقت اور تاریخ میں جاری رہنے والی فکری جنگ کو بنیادی موضوع بنا کر عام معنوں میں جنگ پر مثنوی لکھنے کے امکانات ابھی معدوم ہیں۔ یہ زمانہ صرف فکری رزمیہ مثنوی کے لئے مخصوص نظر آتا ہے۔ فکری رزمیہ کے لئے مثنوی کی تکنیک کی پابندی بھی آج ضروری نظر نہیں آتی۔ اس نے فکری رزمیہ مثنوی کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس بدلتی ہوئی بلکہ بدلی ہوئی صورت حال کو خوش دلی سے قبول کرلینے میں شاعری کا بھلا ہے اور یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ آج زیادہ بنیادی اہمیت فارم کی چند ظاہری شرائط کو نہیں بلکہ موضوع اور شاعر کے رویوں کو حاصل ہے۔

ڈاکٹر صفدر حسین صفدر کو یہ طویل نظم لکھنے کی تحریک کیوں اور کیسے ہوئی۔ یہ جاننے کے لئے ان کی ذات سے کچھ واقفیت یقیناً معاون ثابت ہوگی۔ ڈاکٹر صفدر حسین صفدر فلسفے کے طالب علم بھی ہیں اور استاد بھی اور ان چند اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا ہے جن کی زندگی اقدار کی تفہیم و ترویج میں گزری ہے اور فلسفہ جن کے لئے واقعتاً حُبِ دانش ہی کا نام ہے۔ ان کے ہاں زندگی بھر فکری بلندی پر سانس لینا زندہ رہنے کی شرطِ اوّلین ہے۔ وہ خاموشی سے کام کرتے رہنے والے شاعر ہیں۔ شہرت اور دولت کے حصول کو انہوں نے کبھی مقصد نہیں بنایا وہ صبر اور برداشت کی قابلِ رشک قوت کے مالک ہیں۔ اگر ان کو یہ خوبیاں اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملی ہیں تو خوش قسمتی کی بات ہے۔ ہم بہرحال یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے اساتذہ ڈاکٹر بشارت علی اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کے اثرات ان پر محدود ہیں۔ ان دونوں بزرگوں سے کچھ یاد اللہ مجھے بھی رہی ہے اور میں ان کے علمی شکوہ اور ذاتی خوبیوں سے بہت متاثر رہا ہوں۔ ان دو حضرات کے علاوہ ڈاکٹر صفدر حسین صفدر، پروفیسر سی۔ اے۔ قادر، ڈاکٹر محمد اجمل اور ڈاکٹر منظور احمد سے جو خاص علمی قربت اور عقیدت رکھتے ہیں اسے بھی ان کی شخصیت کی تعمیر میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ دین و سیاست کے معاملات میں ڈاکٹر منظور احمد کی حقیقت پسندانہ اور سائنسی فکر سے میں خود بے حد متاثر ہوں۔ اب جبکہ وہ ایک جامعہ کے وائس چانسلر کے عہدے پر فائز ہیں ہمیں ان سے بڑی امیدیں ہیں۔ ڈاکٹر

ہے کاغذ پہ تحریر خونِ جگر
قلم ہاتھ میں بن گیا اک شرر

نہیں زندگی کا یہاں اہتمام
کہ ہر چیز دنیا میں ٹھہری حرام
لہو میں ہے ڈوبی ہوئی آج شام
نہ لے اپنے قاتل کا دُنیا میں نام

ملاقی نہیں ہے نظر آ کے موت
کہ جب گونجتی ہے ضمیروں کی صوت
وہاں کس نے جیتا مقدر کا کھیل
جہاں کھوٹے سکوں کی ہو ریل پیل

ہیں محروم ہر چیز سے چشم و گوش
کہاں ہے ہمیں آج دنیا میں ہوش
ہے ایمان اپنا فقط ناؤ نوش
اُخوّت کا ہم میں نہیں کوئی جوش

زمیں پوچھتی ہے کہاں ہیں حسینؑ
میسّر نہیں ہے زمانے کو چین
ہوئے کب سے اندھے ہمارے یہ نین
نہیں چلتا کوئی یہاں بین بین

قلمکار دنیا میں دیوار ہے
فریبوں سے پُر دل کا اخبار ہے

منظور احمد ایسی فکر رکھنے والے اور بات کہنے کے حوصلہ کے حامل لوگ ہمارے سکالروں میں زیادہ نہیں ہیں۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان حضرات سے اثر لینے والا ڈاکٹر صفدر حسین صفدؔر کس کردار کا حامل ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر صفدر حسین صفدؔر قوم اور ملت اور پوری نوع انسانی کی زبوں حالی پر افسردہ کیوں ہیں؟ یہ بات اب آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے ڈاکٹر صفدر حسین صفدؔر انسانی اقدار اور اصولوں سے مُحبّت کرتے ہیں۔ چاروں طرف پھیلی ہوئی مایوسی اور بے بسی کا وہ قریب سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس صورتِ حال سے انہیں شدید دکھ بھی ہوتا ہے اور وہ اسے تفصیل سے بیان بھی کرتے ہیں اور اداس بھی ہو جاتے ہیں لیکن فطرت کی طرف سے انسان کو عطا کردہ اس روشنی سے وہ کبھی مایوس نہیں ہوتے جو تاریکی میں ہمیشہ انسان کا سہارا بنتی ہے اور اسے صحیح راستے کی طرف لے جاتی ہے اور جس کا عظیم ترین سرچشمہ قرآن اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہے۔

نظم کے آغاز کے بعد جلد ہی ڈاکٹر صفدر حسین صفدؔر نے بتایا کہ غزاؔلی اور رومؔی ان کے راہبر ہیں۔ پھر چند صفحات کے بعد حاؔلی کا ذکر یوں آتا ہے۔

ملاقات حاؔلی سے اپنی ہوئی   تو کچھ دیر تک گرم محفل رہی

ڈاکٹر صفدر حسین صفدؔر کے ذہن نے نظم لکھتے ہوئے مسدّسِ حالی کو برابر پیشِ نظر رکھا۔ انہوں نے حاؔلی کی طرح قوم و ملّت اور پھر نوع انسانی کی زبوں حالی کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر صفدر حسین صفدؔر فلسفیوں اور دانشوروں کو قوموں اور نوعِ انسانی کی راہ نمائی کا فریضہ ادا کرتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا اس کے باوجود انہیں امید ہے کہ بالآخر یہی لوگ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایات کی روشنی میں دنیا کو امن و سکون کا گہوارہ بنائیں گے۔ چنانچہ آغاز سے آخر تک انہوں نے دنیا بھر کے معروف مفکرّوں، دانشوروں، فلسفیوں، استادوں اور شاعروں کے نام لے کر ان کی اعلیٰ صفات اور خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ یہ فہرست طویل ہے اور ہابیل اور قابیل سے لے کر بُشّ اور گوربا چوف تک، سقراط سے لے کر ڈاکٹر برہان احمد فاروقی تک، افلاطون سے بے نظیر اور نواز شریف تک اور یونان کے ارسطو سے ڈیرہ غازی خاں کے شفقت کاظمی اور ندیم جعفری تک ہر اس نام کو شامل کیا ہے جو معاشرے میں اعلیٰ انسانی اقدار کو مستحکم اور محترم دیکھنے کی آرزو رکھتا تھا اور رکھتا ہے۔

آغازِ نظم میں اگر ڈاکٹر صفدر حسین صفدؔر کی نظر زیادہ ملکی اور قومی حالات پر رہی ہے تو اس کی وجہ واضح ہے حصولِ پاکستان کے چند برس بعد ہی ہمارے ہاں اقدار کی جو بے حرمتی ہونے لگی اس کا احساس تکلیف دہ ہے۔ مارشل لاء نے جس طرح ملک سے اقدار کے احترام اور آزادی کے جذبات کو ختم کرنے کی کوشش کی اس کا نتیجہ شدید بے چینی اور پھر بے دلی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ حکومتوں اور قومی راہنماؤں اور اسمبلیوں نے جس طرح قومی مفادات اور اپنے فرائض کو نظر انداز کیا اور جس طرح بیشتر متعلقہ افراد

اگرچہ یہ انسان خوددار ہے
خودی آج لٹکی سرِدار ہے
قیامت کا ہونے لگا ہے ورود
زمانے نے توڑی ہیں جب سے قیود
دلوں میں بسے ہیں نصاریٰ یہود
زباں پر ہے لیکن سلام و درود

تمدّن کی بیٹی جواں ہے ابھی
ثقافت کا سکّہ رواں ہے ابھی
نصیحت تمہاری گراں ہے ابھی
جہاں گرمِ دل گرمِ جاں ہے ابھی

کئے فتح ظاہر میں کون و مکاں
ہے باطن میں انسان کوہِ گراں
ہیں زیر و زبر پھر زمیں آسماں
خدا کی خدائی سے جائیں کہاں

ہوا آرزو سے یہ خالی وجود
ہوا آج دنیا میں کس کا شہود
زمانے پہ چھائے ہمارے یہود
وہ لینے لگے ہم سے ماضی کا سُود

معزّز زمانے میں زردار ہے
نگہبان عصمت کا فنکار ہے

نے ہر طرح کی بددیانتی کو ضرورت نے قانون بلکہ اصول کا درجہ دے دیا۔ لوٹ مار کا بازار گرم ہے جس کا بند ہونا ممکن نظر نہیں آتا۔ اس کا نتیجہ سوائے افسردگی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ عام طور سے ذہنی پستی اور ذلت کے دنوں میں بھی قوموں نے اپنے فلسفیوں اور استادوں سے توقعات وابستہ رکھی ہیں۔ مجموعی طور سے بھی اور انفرادی طور سے بھی۔ لیکن ہمارے ہاں مجموعی طور سے ان لوگوں سے بھی اعتماد اٹھ گیا۔ ڈاکٹر صفدر حسین صفدر نے اگر کہا کہ

معلّم جہاں بے خبر ہوگیا — جہاں کا جہاں بے خبر ہوگیا

اور

بتائیں کسے اپنا پیرِ مغاں — کہ ہر پیر ہے اپنی ضد میں جواں
مورخ زمانے کا خاموش ہے — حقائق میں وہ مصلحت کوش ہے
حقیقت کا کوئی پُجاری نہیں — صداقت کا کوئی بھکاری نہیں

تو ان کے کرب کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بے روزگاری، بے انصافی، لوٹ کھسوٹ، ڈاکے اور استحصال کے باوجود اگر حسّاس لوگ ابھی زندہ ہیں اور اُمید کا دامن تھامے ہوئے ہیں تو یہ ایک معجزہ ہے جو صرف اس لئے ظہور میں آیا کہ نامِ محمدؐ زندہ ہے اسی لئے ڈاکٹر صفدر حسین صفدر نے تمام عذابوں سے رہائی یا انہیں برداشت کرنے کی قوت کے حصول کا صرف ایک ذریعہ یوں بتایا ہے۔

نگاہِ محمدؐ کے طالب رہو — عمل سے زمانے پہ غالب رہو

یہی معجزہ "آشوبِ میکدہ" کی تخلیق کا مُحرّک بنا اور یہی اس نظم کا بنیادی موضوع بھی ہے۔ چاروں جانب تباہی کی صورتِ حال میں بھی خیر و شر کے درمیان جو مسلسل جنگ جاری ہے اُس نے سوچنے والے اور اقدار سے محبّت کرنے والے ہر ذہن کو میدان جنگ میں خیر کی طرف سے محاذ بنا کر جہاد کر رکھا ہے۔ یہی جنگ ایک ایسے فکری رزمیہ کی محرک ہے جو ڈاکٹر صفدر حسین صفدر نے تخلیق کیا۔ یہ نظم پاکستان اور دنیا بھر میں شعور کے ارتقاء کا عمودی اور افقی دونوں سطحوں پر جائزہ پیش کرتی ہے۔ ہابیل و قابیل سے آج تک کے صاحبانِ اختیار اور اہلِ دانش کے حوالے سے نظم کے عمودی پھیلاؤ کو پیش کرتے ہیں جبکہ اختتام کے قریب نظم چاروں جانب افقی سطح پر پھیلتی ہے۔ قائداعظم تو ہمارے لئے روشنی کا مینار تھے ہی، سیاسی سطح پر ان کے بعد استحکام ملا نہ سکون، امیدیں تو سب سے وابستہ ہوئیں۔ محمد ایوب سے بھی، ذوالفقار بھٹو سے بھی، ضیاء الحق سے بھی، بے نظیر سے بھی، لیکن ایک ایک کرکے سب نے مجموعی طور سے مایوس کیا۔ نہ محمد ایوب اور ضیاء الحق کی بعض خوبیاں ہمارے کام آئیں نہ ذوالفقار بھٹو کی بصیرت، سب کچھ گم ہوگیا۔

قوم میں شامل سمگلروں، مکّاروں اور بے ایمان تاجروں اور سیاستدانوں اور تنگ نظر دینی رہنماؤں نے سب کھالیا۔ ضیاء الحق کے طویل مارشل لاء کے بعد بے نظیر یقیناً "آزادی اور خوشحالی کی علامت بن کر

تقاریر کا گرم بازار ہے
مگر شہر میں قحطِ کردار ہے

خودی و خدا کو نہ کر آشکار
یہی ہیں زمانے کے پروردگار
سمندر انا کا جو کرتا ہے پار
نگاہوں میں چبھتا ہے بن کر وہ خار
کسی کو خودی وہ نہیں سازگار
نہ ہو جس خودی سے خدا آشکار

بدل کون سکتا ہے تیری سرشت
سمجھتا نہیں جبکہ تو خوب و زشت
دکھاؤں تجھے کیا تری سرنوشت
نہ بھائی تجھے آسماں پر بہشت

زمانے کا دیکھو نیا رنگ ہے
ضمیروں میں جاری عجب جنگ ہے
ثقافت کا جامہ بہت تنگ ہے
جو اپنے لئے باعثِ ننگ ہے

ہمارا بدن ہے مثالِ قفس
جہنم کی مانند قصرِ نفس
ہیں دوشِ ہوا پر ابھی خار و خس
نہ کٹ جائے ان سے کہیں ان کی نس

ابھری تھی لیکن اس ملک اور قوم کو ابھی نہ معلوم اور کیا کچھ دیکھنا ہے کہ ملکی سیاست میں وہ انتشار پیدا ہوا کہ بے نظیر سے وابستہ امیدیں بھی دم توڑ گئیں۔ ہم کہ قوم کے نچلے طبقوں سے تعلّق رکھتے ہیں ہمیشہ ہر نئے آنے والے سے امیدیں وابستہ کرلینے پر مجبور ہیں۔ سو اب ہم نواز شریف کی طرف دیکھ رہے ہیں دیکھئے کیا ہو!

ڈاکٹر صفدر حسین صؔفدر نے اس تمام صورتحال کو مثنوی میں منعکس کیا ہے جمہوریت کا پوری طرح حصول ممکن کیوں نہیں ہوتا۔ جمہوریت ملتی ہے تو مستحکم کیوں نہیں ہوتی اور بین الاقوامی سطح پر وہ کون لوگ ہیں جو مسلسل دوسروں کو آزادی سے محروم رکھنے کے لئے برسرِپیکار ہیں۔ امریکہ اور روس، برطانیہ اور فرانس، جاپان اور اسرائیل کیا کر رہے ہیں۔ سب کچھ اس مثنوی میں موجود ہے۔ روس اور امریکہ نے جس طرح چھوٹی قوموں کو مایوس کیا ہے اس کا ذکر بھی نظم میں شامل ہے۔ نظم کا ایک بہت نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس میں شروع سے آخر تک ایران اور امام خمینی اور اسلامی انقلاب ایران کا حوالہ اُمّید اور حوصلے کے سرچشمے کے طور پر آیا ہے۔ کتاب کا انتساب بھی بجا طور پر امام خمینی کے نام کیا گیا ہے کہ انہوں نے بیسویں صدی کے آخر میں امامت اور راہ نمائی اور حکومت کا وہ انداز پیش کیا جس کی مثالیں طویل وقفوں سے ہی کہیں کہیں ملتی ہیں۔ ایران عراق جنگ اور اس کے اثرات اور محرکات پر شاعر سب کے ساتھ شامل ہو کر خون کے آنسو روتا ہے۔ تاہم وہ امام خمینی کی قیادت کو سلام کرتا ہے اور اسلامی دنیا کے لئے اسلامی انقلابِ ایران کو ایک مثال سمجھتا ہے۔ وہ سعودی عرب کی اہمیّت کا ذکر کرتا ہے جو ملّتِ اسلامیہ کا مرکز ہے اور افسوس کرتا ہے کہ اس کی مرکزی حیثیت مستحکم نہیں ہے اور مسلم ممالک ہی نہیں خود عرب ممالک بھی انتشار اور افتراق کا شکار ہیں۔

یہ فکری رزمیہ مثنوی مکمل ہو جاتی اگر بے نظیر سے وابستہ توقعات پوری ہو جاتیں اور اگر وہ آزادی اور خوشحالی کی اسی طرح علامت بنی رہتی جیسا کہ وہ آغاز میں دکھائی دیتی تھی اور ایسا کرنے کا شاعر نے فیصلہ بھی کرلیا تھا لیکن بے نظیر کی حکومت کی موجودگی ہی میں ملکی سیاست میں انتشار کی حالت پیدا کردی گئی۔ اس کے بعد ملک میں بظاہر کوئی بڑا واقعہ نہیں ہوا لیکن بین الاقوامی سطح پر بڑے بڑے ایسے انقلابات رونما ہوئے جن سے متاثر نہ ہونا ہمارے لئے ممکن نہیں تھا۔ کویت پر عراق کا حملہ اور پھر تباہی، سوویت یونین کا خاتمہ اور اشتراکی نظام کی شکست اور افغانستان میں امریکی اور روسی پالیسیوں میں تبدیلی۔ ان سب واقعات سے صرف نظر کرلینا ڈاکٹر صفدر حسین صفدر کے لئے ممکن نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے ان واقعات کا بھی احاطہ کیا اور لکھا ہے کہ ۔

حقائق کو خوں سے کیا ہے رقم　　　　جو پھر سے اٹھایا ہے میں نے قلم

درِ میکدہ پر نہ ٹھہرو ابھی
کہیں اور چل بیٹھیں آؤ ابھی
جہاں سے جو مل جائے لے لو ابھی
کہ ساقی کی جانب نہ دیکھو ابھی

غزالؔی و رومؔی ہیں رہبر مرے
وہ ہیں علم و دانش کے محور مرے
جہالت کے پتّھر نہ ہوں سر مرے
کہ اچھّے نہیں آج تیور مرے
زمیں آسماں ہیں مکدّر مرے
نہیں آج گردش میں ساغر مرے

مجھے زندگی سے بڑا پیار ہے
اگرچہ یہ کندھوں پہ اک بار ہے
زمانہ لہو کا طلب گار ہے
کہ اس میں ترنگوں کا اظہار ہے
فضاؤں میں پتّوں کی جھنکار ہے
کوئی پھول شاید سرِ دار ہے

میں گرنے لگا ہوں سنبھالو مجھے
نشے میں گلے سے لگا لو مجھے
من و تُو کی تہہ سے نکالو مجھے
اور اپنا مقرّب بنا لو مجھے

اور اس رجائی شعر پر بات ختم کی ہے

ہے صفدر کی آنکھوں میں رقصاں غزال [illegible] نفسی ہے، محبت ہے [illegible]

ڈاکٹر صفدر حسین صفدر نے "تنازع للبقا" کے اصول، قانونِ فطرت سے [illegible] ہے۔ انہوں نے فکری ارتقاء، خیر و شر اور اقدار کے درمیان [illegible] زندگی کرنے کے لئے لازم قرار دیا ہے۔

جو حاصل ہو انسان کو ارتقاء [illegible] اسی میں ہے [illegible]

بین السطور نظم میں جگہ جگہ پاکستانی قوم اور ملتِ اسلامیہ کی حقائق سے بے تعلقی اور اس سے نتیجے میں ظاہر ہونے والی بے بسی پر ماتم کیا ہے۔ "تنازع للبقا" زندگی کا ایک بے حد اہم بنیادی اصول ہے۔ صورتِ حال کوئی بھی ہو، مثبت کاروائی کے لئے قوت اور توانائی کا حصول لازم ہے۔ لیکن ہم یہ بات اکثر وقت گزرنے کے بعد سوچتے ہیں۔ امریکہ اگر اپنے اتحادیوں [illegible] حکومت [illegible] ہے اور اپنی شرائط پر دوسرے ملکوں کو زندہ رہنے کی اجازت دے رہا ہے تو اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ کہ یہ اصولِ تنازع للبقا کے عین مطابق ہے۔ روس کی اس سلطنت کا خاتمہ [illegible] ایسا واقعہ ہے جسے خود امریکہ کو بھی ہمیشہ سامنے رکھنا چاہیے کہ دوسرے ملکوں کی طرح [illegible] اکائیوں اور جغرافیائی قوموں اور ریاستوں کا ایک ڈھیلا (لیکن مضبوط) اجتماع ہے۔ [illegible] تنازع للبقا اور تاریخی جدلیات کو فراموش کر دینا ہمیشہ ایک نئے انتشار کا پیش خیمہ بنتا ہے۔

دنیا بھر میں ایک فکری رزمیہ مسلسل جاری ہے۔ پاکستان میں صورتِ حال [illegible] احمقانہ بے تعلقی، خود غرضی انتہا درجے کی بددیانتی کی وجہ سے درستی کی توقع نظر نہیں آتی۔ جس قوم کے بہت سے 'اراکین اسمبلی' راہ نما اور اہم تاجر سمگلنگ، ادویہ اور خوراک میں ملاوٹ [illegible] اور مہلک نشہ آور اشیاء کی تیاری میں ساری زندگی مصروف رہیں۔ [illegible] اس قوم کو مزید ذلت سے کوئی نہیں روک سکتا۔ فلسفی اس صورتِ حال پر ماتم کناں ضرور ہے لیکن وہ چونکا کر بتاتا ہے کہ اگر قوم کے افراد ہوش و خرد سے کام لیں تو تقدیر کو اپنے ہاتھوں سے بنا سکتے ہیں۔

"آشوبِ میکدہ" میں فلسفیوں، شاعروں اور دانشوروں کے نام باقاعدہ اور مکمل زمانی ترتیب سے سامنے نہیں آتے بلکہ یہ نام ایک آزاد تلازمے میں منسلک ہیں۔ فکری رزمیے میں جہاں کہیں شاعر کا وجدان محسوس کرتا ہے کہ کسی دانشور فلسفی یا شاعر کا ذکر آنا چاہیے، آجاتا ہے، وجہ یہ ہے کہ یہ نظم فکر کے ارتقاء پر لکھی مثنوی نہیں ہے بلکہ "میکدہ" میں برپا ہونے والے "آشوب" کی داستان ہے۔

اردو زبان میں اپنی نوعیت کی، مثنوی کے باقاعدہ مکمل آہنگ میں لکھی ہوئی یہ پہلی نظم ہے۔ نظم کسی خیالی کہانی، کسی فرضی واقعے یا کسی قومی داستانِ پارینہ کو موضوع نہیں بناتی بلکہ اس عصر کے آشوب کو پیش کرتی ہے جو شاعر کا اپنا عصر ہے۔ اس نظم کی تخلیق نے اردو شاعری کے امکانات کو بالعموم اور اردو مثنوی

میں قندیل ہوں تم جلا لو مجھے
اندھیروں میں اپنے اجالو مجھے
مری آگ سے تم بچا لو مجھے
اور اپنے بدن میں رچا لو مجھے

محبت کے دیپک جلائے گئے
صنم پتھّروں سے بنائے گئے
اندھیروں کے سائے گھٹائے گئے
اُجالوں کے دریا بہائے گئے
رموزِ مُحبتّ سکھائے گئے
حقیقت سے پردے اٹھائے گئے

اندھیروں کی چادر ہٹائی گئی
اجالوں کی محفل سجائی گئی
عبث بات ہے جو بتائی گئی
وہ مِنّت ہی کیا جو جتائی گئی
ہے لمحوں میں دنیا بنائی گئی
مگر عمُر کتنی بڑھائی گئی

درِ میکدہ پر نہیں ہے ہجوم
گلستاں میں چلتی ہے بادِ سموم
حجابوں میں رکھتے ہیں ہم کو علوم
کہ ہر وقت کرتے ہیں گردش نجوم

کے امکانات کو بالخصوص وسعت دی ہے۔ ڈاکٹر صفدر حسین صفدر نے نظم کی زبان کو بطورِ خاص سجانے اور بیان کو مرصع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ بیان کے بہاؤ کو اپنے فطری زور میں آگے بڑھنے دیا ہے۔ جس نے نظم کے اسلوب کو تصنّع سے محفوظ رکھا ہے۔ یہ نظم اردو شاعری میں ایک بہت بڑا اور عُمدہ اضافہ ہے۔

ڈاکٹر عرش صدیقی

حقوق و فرائض کا پرچار ہے
غریبوں کی گلیوں میں للکار ہے
یہ ہر سمت روحوں کی مہکار ہے
کہ ہر جسم خوشبو کا انبار ہے

یہ فرمان پڑھ کر سنایا گیا
صداقت پہ فتویٰ لگایا گیا
حقائق سے پردہ اٹھایا گیا
پھر انساں کو انساں بنایا گیا

جب انسان انساں سے لڑنے لگے
تو کام اس جہاں کے بگڑنے لگے
مروّت کے لاشے بھی سڑنے لگے
تشدد کے اولے بھی پڑنے لگے

نئی نسل دنیا میں بیدار ہے
روایت سے اپنی وہ بیزار ہے
اماں کی جہاں میں طلبگار ہے
ہماری نظر کی سزا وار ہے

نئی نسل کو اب شکایت ہے کچھ
بزرگوں کو اُن سے عداوت ہے کچھ
یہ جدّت ہے کچھ اور روایّت ہے کچھ
غرض ان کے دل کی حقیقّت ہے کچھ

ذ

آشوبِ میکدہ

اس نظم کا ہیولیٰ ایسے عناصر سے تیار ہوا ہے جو مختلف ابعاد ہوتے ہوئے غیر معمولی جذبیت اور کیف و اثر کی حامل ہے۔ اس میں نہ صرف ہمارے گرد و پیش کے گوناگوں حالات و واقعات کی عکاسی کی گئی ہے بلکہ ان افکار و خیالات کی عکاسی بھی کی گئی ہے جو ان حالات و واقعات سے متاثر ہونے پر ہمارے دل پر مرتب ہوتے ہیں اور ان پر گہرے نقوش چھوڑتے ہیں۔ شاعر کی نظر ان مشاہدات ہی پر نہیں جو اس نے بیرونِ در اور اپنے عہد میں محسوس کئے ہیں بلکہ اس کی لپیٹ میں عہدِ ماضی کے تمام حالات و واقعات بھی ہیں جن کی بِنا پر اس نے اپنے تاثرات قائم کئے ہیں۔ ان حالات میں عام انسانوں کے تصورات ہی شامل نہیں جو اس کے شریکِ نظر ہیں بلکہ گزشتہ و موجود مشاہیر عالم نے وقتاً فوقتاً جو نظریات قائم کئے وہ بھی پیشِ نظر ہیں۔ اس طرح نظم کا دائرہ کتنے ہی دائروں کو محیط ہو کر وسیع ہو گیا ہے اور حیات و کائنات دونوں پر حاوی ہے گویا نظم ایسا دریچہ ہے جس سے حدِ نظر تک دریچے ہی دریچے کھل جاتے ہیں اور محیطِ کل منظر پیش کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ مجمع البحرین یا مجمع البحور ہے۔ یہ ہر جہتی اس میں غیر معمولی پھیلاؤ پیدا کرتی ہے اور اس میں ہم کسی وقت کسی بھی سمت نکل سکتے ہیں۔

اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ یہ اسرار و رموز اور حقائق و معارف کا مجموعہ ہے جس سے "سنائی" کی حدیقۃ الحقیقت" رومی کی "مثنوی معنوی" یا دیگر اربابِ فکر و نظر کے مشاہدات حق کا مجموعہ ہے۔ بلکہ فلسفے سے حذر کرتے ہوئے تمام تر اصلیتوں پر نظر رکھی گئی ہے جن کو ایک عام شخص بھی جانتا اور محسوس کرتا ہے۔ بالخصوص آج کا شخص خواہ مشرق سے تعلق رکھتا ہو یا مغرب سے، لیکن کسی نے بھی ان کو نظم بند کرنے کی کوشش نہیں کی اور جب وہ ان کو تحریر کی شکل میں دیکھتا ہے تو گدگدی محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ شاعر کی حیثیت تمام تر عام ناظر کی ہے وہ لغت ہائے مجازی اور فکر و بیان کی ہنگامہ آرائی کا قائل نہیں بلکہ جو کچھ دیکھتا ہے بعینہٖ پیش کر دیتا ہے۔ نظم اسی طرح رواں دواں ہے جس طرح اس کا اندازِ فکر۔ اس سے پہلے شاعری نظم و ضبط کی پابند رہی ہے۔ شاعر فن کار کی حیثیت سے سامنے آتا ہے اور قدرتِ فن کا مظاہرہ کرتا ہے روایتی شاعری در و بست اور مرتب پیرائے کو ملحوظ رکھتی ہے اس لئے شروع سے آخر تک نظم کے اجزاء آپس میں مربوط نظر آتے ہیں اور بیان و معنی میں تسلسل دکھائی دیتا ہے۔ یہ نظم آزاد شاعری نہ ہوتے ہوئے بھی آزاد ہے۔ اس کا ہر بند کسی بھی جگہ واقع ہو سکتا ہے اور اس نقلِ مکانی سے نظم میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوگا کیونکہ بہاؤ آزاد بہاؤ ہے اور اس اعتبار سے یہ اپنی قسم کی پہلی قابلِ لحاظ نظم ہے۔ شاعر کے ذہن میں بیک وقت ہر قسم کے افکار و مشاہدات موجود ہیں اور ان میں سے کوئی بھی کسی وقت اس کی سوچ میں آسکتا ہے اور وہ اس کی صورت گری کر سکتا ہے۔ اس لئے نظم بے ساختہ ہے جس میں

کسی کو کسی سے لگاؤ نہیں
کہ یوں بن کے ہم کو بناؤ نہیں
یہ خوابیدہ فتنے جگاؤ نہیں
یہ ماضی کے قصّے سناؤ نہیں

گلستاں میں شعلے لپکتے رہے
وہ پہلو سے میرے سرکتے رہے
نگاہوں میں ساغر چھلکتے رہے
کہ پلکوں پہ آنسو چمکتے رہے

مُحبّت کی دنیا خیالی ہوئی
کرن ظلمتوں میں سوالی ہوئی
مروّت زمانے میں گالی ہوئی
یہ ناگن ہے اپنی ہی پالی ہوئی

کیا دھرم اپنا دلوں کا افق
کمال اُس کے باقی سیاق و سبق

زمانے کا لینن پریشان ہے
کہ حکمت کے سینے میں طوفان ہے
صلیبِ محبت پہ جبرانؔ[10] ہے
صداقت کے شعلوں میں لبنان ہے

---

۱۰ خلیل جبران (لبنان)

خیالات بے تکان ادا کئے جاتے ہیں کسی وقت کسی بھی خیال کی ترجمانی کا یہ عالم ہے کہ ایک ہی بند میں اُن میں کچھ ہے، اُن میں کچھ ہے۔ اضداد اور مغایر خیالات ہیں کہ بے اختیار جمع ہوتے جاتے ہیں لیکن نظم اپنی مخصوص کیفیت برقرار رکھتی ہے اور قاری اس بے پروا انداز سے محظوظ ہوتا ہے۔

شاعر کو اپنے دیگر ہم مشربوں کی طرح شاعری کا دعویٰ نہیں اس لئے وہ اپنی رو میں بہے جاتا ہے نہ کوئی منزل نہ قیام، بلکہ ہر شعر اور اس کا خیال اپنی منزل آپ ہے۔ شاعر کو سرِ راہ جو بھی مشاہدہ نظر آئے وہ اسے اپنا لیتا ہے۔ اس کے بے پروا خرامی قدرتِ فن سے بے نیاز ہے یہ بڑی ہی بے تکلّف قسم کی سخن آرائی ہے۔ صاحبِ نظم شاعرانہ طبیعت کا مالک ہے اور شعر کی زبان ہی میں گفتگو کرتا ہے اس لئے قدرتی طور پر کلام میں شعری عناصر موجود ہیں جیسے دریا کی سطح پر پھیلے ہوئے پھول بہے جا رہے ہوں۔ طبّاعی کے جوہر اس میں جھلکتے ہیں۔ شاعر خوش فکر ہی نہیں خوش طبع بھی ہے اس لئے جہاں کلام میں لطافت اور شگفتگی ہے وہاں طنز و مزاح کا عنصر بھی ایک لطیف امتزاج پیدا کرتا ہے۔ یہ شہد و نمک کا ذخیرہ بہت پُر لطف ہے۔ شاعر یہ کہتا معلوم ہوتا ہے لیجئے میں نے کیسی تہہ دار مگر چٹخارے دار باتیں کہی ہیں۔ آیئے آپ بھی ان سے لطف اندوز ہوں اور ہم ان سے واقعی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے فن کے تقاضے بھول جایئے اور شاعر جو کچھ جس پیرائے میں کہے اسے قبول کرتے جایئے اور بقدرِ ذوق حظ اٹھایئے۔ نظم کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں جا بجا کھبے اور چبھتے ہوئے نشتر اور پر لطف اشعار دکھائی دیں گے بعض اشعار پر ہم بھی اس کے ساتھ ہنس دیں گے لیکن ساتھ ہی تلخ حقائق کی نشتریّت بھی محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔

ایسی نظم کی کوئی حدود مقرّر نہیں ہو سکتیں جتنا چاہو اسے طول دے دو۔ معنی میں رسوم و قیود سے آزاد ہوتے ہوئے یہ ہیئت میں بھی آزاد ہے۔ بندات میں ہم قافیہ اشعار کی تعداد بدلتی جاتی ہے۔ کہیں چار ہیں، کہیں چھ اور کہیں اس سے بھی زیادہ غیر مقرّر، ایک ہی بند کے ایک مصرع میں جو کچھ کہا جاتا ہے عجب نہیں دوسرے میں کچھ اور ہو جائے۔ یہ تضاد بھی لطف دیتا ہے۔ یوں سمجھ لیجئے شاعر نے نظم میں غزل کا ہر قدم بدلتا ہوا انداز اختیار کیا ہے۔ غزل کی سراپا نیرنگ روح اس پر حاوی ہے اردو میں تاحال مستعملات کی یہ وضع کہیں اختیار نہیں کی گئی۔ میرے ایک دوست ع۔ س۔ مسلم نے "کاروان حرم" کے عنوان سے ایسی ہی نظم لکھی ہے اس کی بنیادی دشواری یہ ہے کہ تمام مصرعے کس طرح ہم قافیہ ہوں۔ اگر "کلیم" قافیہ ہے تو دوسرے مصرعوں میں اس کے موافق قافیے کیسے لائے جائیں۔ اسی سے کسی بھی قافیے اور کسی بھی خیال کا امکان پیدا ہوتا ہے اور یہ کیفیت ہوتی ہے کہ "نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں" کاروان حرم میں بڑی کاوش سے برجستگی اور روانی برقرار رکھی گئی ہے۔ نیز بنیادی تصوّر ایک ہی ہوتے ہوئے بے ربطی پیدا نہیں ہوتی۔ اگرچہ بندوں میں الگ الگ خیالات ادا کئے گئے ہیں۔ مسدّسِ حالی میں بھی ایسی ہی صورت حال تھی لیکن اس میں مد و جزر اسلام کے مرکزی تصوّر کی وجہ سے وحدت برقرار رہی۔

ثقافت کا بازار سنسان ہے
تمدّن کی بانہوں میں انسان ہے

مصوّر کا باطن نمائش بنا
کہ لفظوں کا عنواں ستائش بنا

مُحبّت کی دلہن عداوت بنی
جوانی ہماری قیامت بنی
رذالت جہاں میں شرافت بنی
شرافت کی لونڈی ثقافت بنی

ارسطو[1] کی منطق بھی بیکار ہے
اگرچہ وہ حکمت کا معیار ہے

جو فکر و نظر میں گرفتار ہے
وہ دنیا کی نظروں میں بیمار ہے

جو عزم و یقیں کا سزاوار ہے
وہ اپنے عمل کا گنہگار ہے
ضمیروں کے زنداں میں جھنکار ہے
عناصر میں اس درجہ پیکار ہے

یہ دنیا کچھ ایسی طرحدار ہے
سروں پر جو اونچا سا دربار ہے

---

[1] ارسطو 384 ق۔ م میں ستاجیرا میں پیدا ہوا۔ اسے عام طور پر منطق کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔

اگرچہ مسدّس اور اس نظم کے موضوع اور مقاصد جدا جدا ہیں لیکن جن حالات کے تحت یہ لکھی گئی ہیں ان میں ایک گونہ مشابہت ہے۔ حالی کے پیشِ نظر دنیائے اسلام خصوصاً برصغیر پاک و ہند کے حالات تھے۔ اس نظم میں اسلام کے علاوہ ایسے تمام عالمی حالات ہیں جن سے نوعِ انسانی آج دوچار ہے۔ نظم میں زیادہ تر عالمی صورتِ حال ہی پیشِ نظر ہے لیکن شاعر کو بھی مسدس کی رونے والی اسلامی ماضی یاد آتی ہے اس طرح وہ بے حد ڈانواں ڈول ہے۔ وہ یہ جان نہیں پاتا کہ اس کی وابستگی اسلام سے ہے اور وہ اس کی عبرت ناک حالت کا رونا رونے لگتا ہے۔ یہ بعینہ اقبال کی طرح ہے جس کے دو رخ ہیں ایک جدید اور مستقبل کی طرف اور دوسرا ماضی کی طرف ہے۔ وہ روایت کا مخالف بھی ہے اور علمبردار بھی۔ یہاں تک کہ وہ تمام تر ماضی کے دھندلکوں میں کھو جاتا ہے۔ اسے شکایت ہے کہ یہ اُمت روایات میں کھو گئی ہے اور ساتھ ہی وہ خود سرتاپا روایت میں غرق ہے۔ ہمیں لامحالہ زیادہ نمایاں موضوع کو مدِنظر رکھنا ہے جو آج کے عام انسان اور شاعر میں مشترک ہے اور ہم اس سے زیادہ متاثر ہیں اس طرح یہ نظم عہدِ حاضر اور نوعِ انسانی کی حالت زبوں پر نوحہ ہے جس میں شیکسپیر کے مسخروں کی طرح سنجیدگی اور مزاح دونوں شامل ہیں۔ شاعر نوعِ انسانی کی کج روی اور ابتدا سے اب تک اس کے "اک صورت خرابی کی" میں مبتلا ہونے کے سبب بے حد برگشتہ ہے اور صاف گوئی سے کام لیتا ہے۔ اس طرح وہ آگے سے آگے بڑھتا ہوا ایک وقت پیچھے بھی ہٹتا جاتا ہے وہ رہ رہ کر نوعِ انسانی کے شومیٔ کردار پر چوٹیں کرتا ہے اور بڑی شدید چوٹیں۔ جہاں نظم کے پردے سے بڑے لطیف اشعار نکلتے ہیں۔ وہاں تلخ و تیز زہر میں بجھے نشتر بھی بری طرح کاٹ کرتے ہیں۔ یہ دونوں رویں برابر جاری رہتی ہیں اور ہم ان میں برابر بہے جاتے ہیں جہاں بھینی بھینی خوشبو والے پھول جھڑتے ہیں۔ وہاں سانپ اور بچھو لوٹیاں بھی قدم قدم پر موجود ہیں۔ نظم کے ایک دو فن پارے ملاحظہ ہوں۔

جو واعظ ہے منبر پہ مکّار ہے
ریا کار ہے اور عیّار ہے
ضمیروں میں جس کی یہ جھنکار ہے
وہ پازیب کتنی طرحدار ہے

وہ دن دخترِ رز کا منایا گیا
لہو ساغروں میں پلایا گیا
حرم میں مُغنّی بلایا گیا
وہاں نغمۂ دیر گایا گیا

گلی میں برہنہ ہے رقصِ حیات
لٹی چاندنی میں ہوئی برات
قیامت کی مانند گزری ہے رات
محلِ نظر ہے ابھی دن کی بات

ملا شہر میں ہم کو جو راہ گیر
زر و سیم کا اس کو پایا اسیر
صنم در بغل ہے حرم کا امیر
شریعت کے ماتھے پہ کالی لکیر

زمیں پر یہ جسموں کا بازار ہے
کہ بے بس یہاں ہر خریدار ہے
گنہگار گرچہ گنہگار ہے
نظر میں وہ صوفی کے دلدار ہے

تمدن کی دیوی امانت نہیں
بپا پھر بھی کوئی قیامت نہیں
کسی کی کسی دل میں چاہت نہیں
کوئی زندگی کی علامت نہیں

تمہیں یاد کوئی رفاقت نہیں
فراموشیوں پر ندامت نہیں
یہاں کوئی محتاجِ حاجت نہیں
فقیری برائے ضرورت نہیں

کوئی بزمِ بزمِ ثقافت نہیں
ادب آئینہ دارِ حکمت نہیں
کوئی شخص بے غرض و غایت نہیں
کسی کے بیاں میں صداقت نہیں

مجھے آپ سے کچھ شکایت نہیں
شکایت ہو کیا جب عداوت نہیں
شرف میں بڑی آدمی کی ہے ذات
سمجھتا نہیں آدمی کیوں یہ بات

سر بزم محشر اٹھایا گیا برہنہ حسینوں کو لایا گیا
مروت کا لاشہ جلایا گیا اور انساں کو حیواں بنایا گیا

ان اشعار سے جو صورت حال عیاں ہے وہ "آشوبِ میکدہ" نہیں تو اور کیا ہے۔ شاعر نے تمثیلاً" عالم کو میکدہ قرار دیا ہے اور اس میں اقبال کو بھی دخل ہے جس نے "ساقی نامہ" میں اسی قسم کے حالات کی عکّاسی کی ہے لیکن یہ نظم مربوط و مسلسل ہوتے ہوئے پختہ اور شستہ و رفتہ ہے اور فن کے تقاضے سے بوجہ احسن ہمکنار۔ نیز متکلّم کی شخصیت پوری طرح واضح ہے۔ موجودہ نظم میں اس کی شخصیت کے کئی قرائن ہیں کہیں ساقی کا شائبہ ہوتا ہے تو کہیں شاعر کا یا کسی بھی شخص کا۔ بات آخر میں وہی آزاد بہاؤ (STREAM OF CONCIOUSNESS) کی بنتی ہے جس میں خیالات برابر کروٹ بدلتے جاتے ہیں۔ جیسے کوئی فانوس گردش میں ہو اور اس میں خدا جانے کس وقت کون سا پیکر سامنے آجائے یا بچّوں کو جو بائیسکوپ دکھایا جاتا ہے اس میں کبھی "بمبئی" اور کبھی "آگرہ" اور کبھی کسی اور ہی مقام کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن بچّے ہیں کہ جو بھی تصویری شکل میں سامنے آئے اس سے محظوظ و مسحور ہوے جاتے ہیں۔ پھر ہم قاری بھی تو بالغ بچے ہی ہیں اور شاعر کا کھیل خاصا دلچسپ ہے۔ نظم میں ساقی نہ میکدہ کی مناسبت برقرار رکھی گئی ہے اگر ایک طرف کوئی بے نام مبصّر ہے تو دوسری طرف جہانِ ہست و بود' بہر حال ساقی اور شاعر میں برابر خلط ملط ہوتا رہتا ہے اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ صاحبِ سخن کون ہے۔

جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے یہ نظم ایسا محیط ہے جو حیات و کائنات دونوں پر حاوی ہے کیونکہ سرسری باتوں سے گزر کر شاعر گمبھیر باتوں پر بھی آجاتا ہے اور اس کا تبصرہ کائنات اور حیات دونوں پر ہے۔ عالمِ انسانیت میں تو ایک صورت خرابی کی ہے ہی۔ شاعر کے کائنات کے بارے میں بھی سنگین خیالات ہیں جن کا عکس بے شمار مشرقی و مغربی فلسفیوں کے تصوّرات میں نظر آتا ہے۔ اس طرح نظم میں گمبھیرتا کے ساتھ پھیلاؤ بھی پیدا ہوگیا ہے جس کی نوعیّت آفاقی ہے۔ شاعر فلسفے کا طالب علم رہا ہے اور اسے جدید سائنس اور علوم خصوصاً" نفسیات سے بھی دلچسپی ہے اس لئے وہ ان تمام علوم اور ان کے علمبرداروں کے افکار و نظریات کو کلام میں سمو کر اپنا مخصوص تناظر پیدا کرتا ہے۔ اردو میں اس قسم کا پھیلاؤ بہت کم دکھائی دیتا ہے اس میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے جب ہم حوالوں پر نظر ڈالتے ہیں جو ایران کے ادب' تاریخ تہذیب و تمدن اور مشاہیر کے بارے میں پیش کئے گئے ہیں اور خاصی گہری واقفیت کی خبر دیتے ہیں۔ اس طرح شاعر حیات و کائنات کو محض عام انسان کی نظر سے نہیں دیکھتا بلکہ دونوں میں ڈوب کر بات کرتا ہے اور یہ بڑی بات ہے۔ شاعری سے قطع نظر صرف اسی پہلو سے دیکھا جائے تو یہ نظم اردو میں ایک قابل قدر اضافہ ہے یہ اس لحاظ سے خصوصاً" قابل توجہ ہے کہ اس کا بہاؤ ہمیں اپنے ساتھ بہائے لئے جاتا ہے اور ہم دست و پا بستہ بغیر اس میں بہتے جاتے ہیں۔ میں خود بھی اس میں بہا ہوں اور قارئین کو بھی اس کی دعوت دیتا ہوں یہ "آشوب میکدہ" ہی سہی لیکن ہے تو میکدہ۔

رفیق خاور

فضائل سے وہ شخص محروم ہے
جو مقتل میں باطن کے معصوم ہے
نیا دور دورِ روایت نہیں
کسی بات پر اب ملامت نہیں

وہ آغوش میں آ کے محجوب ہے
حیا کا طریقہ بہت خوب ہے
یہ عریاں بدن میں جو محبوب ہے
وہ روحوں کو دنیا میں مرغوب ہے

فلسطینیوں کا نہیں ہے وطن
جلے گا بہاروں میں سب کا چمن
تجھے لے گئی ہے کہاں پر لگن
کہ سائے سے جلنے لگا ہے بدن

ہوئے ختم آکر جہاں فاصلے
یہی فاصلے ہیں رواں فاصلے
زمیں پر نہیں ہیں کہاں فاصلے
جواں ہی رہیں گے جواں فاصلے

یہ کشمیر یوں آج دل گیر ہے
کہ مردہ ضمیروں کی تصویر ہے
جو حسن و محبّت کی تنویر ہے
لہو کی جبیں پر وہ تحریر ہے

حرُوفِ چند

مَیں اپنے موضوع سے اس وقت تک پوری طرح انصاف نہیں کر سکتا جب تک میں اپنے دور کے حالات اپنے عصری سوچوں، رویوں، قومی، بین الاقوامی حقائق و مسائل اور مشرق و مغرب کے فلاسفہ، مفکّرین کے خیالات و افکار اور علماء و صوفیاء کے طرزِ عمل اور ادباء و شعراء کے کلام کے مطالعے میں ذہنی دیانت اور خلوص کو پوری طرح ملحوظ نہ رکھوں اس کے بغیر میں اپنی ذاتی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا اور نہ ہی اس موضوع پر غور و فکر کی دعوت کا حق ادا ہو سکتا ہے۔ میرے نزدیک اگر نظری و فکری اعتبار سے غور و فکر، عمل پر منتج نہ ہو تو فکر و نظر کی حیثیت فکرِ عقیم سے زیادہ متصور نہیں ہو سکتی۔ یہ نظم محض نظریاتی موشگافی کی خاطر نہیں لکھی گئی اس لئے مجھے امید ہے کہ نظم "آشوبِ میکدہ" کا قاری میری کاوش پر توجہ دے گا اور ماضی، حاضر اور طرزِ بیان کی نسبت تلخی کا شائبہ ہو تو بھی میری تلخ و شیریں فکر کو اس لئے بھی پوری توجہ سے پڑھا جائے گا۔

کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی

میں مسائل کو سمجھتا ہوں اور سمجھ کر لکھنا چاہتا ہوں۔ میرا یہ طرزِ عمل مقبولیت کوشی اور مصلحت اندیشی کے منافی ہو تو ہو مگر غلط نوازی اور بے جا تواضع کے داغ سے داغدار نہیں۔ میں نے عالمِ انسانیت کے ماضی، حال اور مستقبل کو تہِ دل سے قبول کیا ہے اور مجھے اس پر فخر بھی ہے۔ میں نے کسی چیز یا شخص یا ملک یا مذہب یا عقیدے یا کسی سیاسی نظریے کو رد نہیں کیا بقولِ شاعر "جو ذرّہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے" بلکہ جو کچھ مجھ پر گزری اور جو کچھ میں نے محسوس کیا اور جو کچھ دیکھا اسے انتہائی غیر جانبداری سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ بھی ایسے بکھرے ہوئے دور میں جبکہ الفاظ و معنی اپنی قدر و قیمت اور اہمیّت کھو چکے ہیں۔ میرے نزدیک غیر جانبداری ہو ہی نہیں سکتی یہ بھی جانبداری کی ہی ایک صورت ہے اگر مصلحت دور اندیشی سے عبارت ہے تو مجھے اس سے انکار نہیں۔

افکار و خیالات اور تاثرات کو شاعری کا لباس پہنانے کے لئے قطع و برید کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ جو فکر جس بحر و وزن میں ڈھل جائے اور جس ردیف و قافیہ سے ہم آہنگ ہو جائے۔ جس طرح کوئی لباس کسی خاص جسامت ہی کو زیب دیتا ہے۔ اسی طرح کوئی فکر و خیال کسی خاص بحر، ردیف اور قافیہ ہی میں حسن دیتا ہے۔ میں اسے حُسنِ کاوش کم اور حُسنِ اتفاق زیادہ سمجھتا ہوں۔ کسی نظم میں سائنسی نظم و ضبط کو قائم رکھنا انتہائی محال ہے اور اقلیمِ شاعری میں سائنسی فکری ربط اور تاریخی ارتقاء کو نظم میں ڈھونڈنا مناسب نہیں۔ اگر کسی نظامِ فلسفہ کو شاعری کا لباس دینے کی کوشش کی جائے تو اس صورت میں شاعری اپنا وجودِ معنوی کھو بیٹھے گی۔ ان دو میں سے کوئی ایک ہی چیز باقی رہ سکتی ہے۔ میری نظم "آشوبِ میکدہ" جس زبان،

کہاں آج کوئی جہانگیر ہے
کہ نورِ جہاں جس کی اب ہیر ہے

ہر اک شخص دنیا میں آزاد ہے
لبوں پر مگر پھر بھی فریاد ہے
جو تیشہ بکف ہے وہ فرہاد ہے
مگر جوئے شیر اب کسے یاد ہے

کوئی مدرسوں میں سیاست نہیں
سمجھنے میں ان کو قباحت نہیں
کسی گفتگو میں حلاوت نہیں
کسی کو کسی سے شکایت نہیں

رقیبوں میں کوئی رقابت نہیں
مگر اک بدن پر قناعت نہیں
امانت اگرچہ خیانت نہیں
مگر آدمی کی ضمانت نہیں

کہیں بادہ نوشوں کی کثرت نہیں
کسی میکدے میں قیامت نہیں

نگاہوں میں تقدیسِ بہرام ہے
کہ بہرام میں رام کا نام ہے
جو پینے پلانے میں بدنام ہے
وہ رندوں کے مشرب پہ الزام ہے

ردیف، قافیہ، فکری ربط اور ارتقاء کی متحمل ہو سکتی تھی۔ حتی الامکان اس کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور کسی نام نہاد پابندی کو پیشِ نظر نہیں رکھا گیا۔

میری شاعری کو اگر اُسے شاعری کہہ سکیں تو یہ ایک سعیٔ پُرخلوص کا نتیجہ ہے۔ زندگی قومی اور بین الاقوامی سطح پر جس رنگ روپ، جس سنگ و آہنگ، جس ظلمت و نور اور جس شکل و صورت میں میرے سامنے آئی ہے میں نے اس کی سچّی تصویر پیش کرنے کے لئے زبانِ شعر کا سہارا لیا ہے اس کے علاوہ مشرق و مغرب کے فلاسفہ و مفکّرین کے خیالات و افکار اور صوفیاء و علماء اور ادباء و شعراء کے کلام سے متعلق جو تاثرات مرے دل و دماغ پر مرتّب ہوئے وہ حسبِ مقدور شاعری کی زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ آخر میں بالخصوص بہ عنوان "مستقبل جمہوریت کے آئینے میں" کے حوالے سے اپنے تاثرات کا اظہار کرکے نظم "آشوبِ میکدہ" کو پایۂ تکمیل تک پہنچا چکا تھا اور خیال تھا کہ شاید یہ نظم اشاعت کی آخری منزل کو عبور کرلے گی لیکن چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر ایسا نہ ہوسکا۔ پھر 1990ء اور 1991ء کے دوران عالمی افق پر ایسے قومی اور بین الاقوامی انقلابات رونما ہوئے جنہیں "آشوبِ میکدہ" کے موضوع کے لحاظ سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہ تاریخ کے وہ عظیم ترین حادثات و واقعات ہیں جنہوں نے عالمی فکری رویوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے اور جن کے اقوامِ عالم پر گہرے اثرات مرتّب ہوں گے۔ اس پس منظر میں نئے حالات اور نئے ابھرتے ہوئے منظر نامے سامنے آئیں گے اور ایسے سوالات سے دوچار ہونا پڑے گا جن کے جوابات جذبات سے کہیں زیادہ فکری تحمّل اور غیر جانبداری ہی سے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ ان تمام حالات کے پیشِ نظر مجھے دوبارہ قلم اٹھانا پڑا اور اس دوران جو کچھ میں نے دیکھا اور مشاہدہ کیا انہیں نظم کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرے ہر شعر کا کوئی نہ کوئی پس منظر ہے میرے کلام میں میری زندگی بھی ہے اور دوسروں کے کردار کا عکس بھی۔ راہِ حیات میں کاریگر اور بازی گر، نفس کو رشوت دینے والے اور جذبات سے کھیلنے والے ملے ہیں۔ ریاکاری، مکّاری اور عیّاری جب کسی معاشرے کا مزاج بن جائے تو لوگ اپنے رویّہ کو مدبّرانہ قرار دیتے ہیں یہ مقامِ افسوس ہے کہ اقتدار پرست بہت ہیں اور اقدار پرست بہت ہی کم۔

میں فلسفہ کا طالب علم ہوں اور وہ بھی ناکام طالب علم میری شخصیت کی تعمیر میں کاریگروں او بازی گروں کا ہاتھ ہے عوام و خوّاص بھی اس میں پیش پیش ہیں۔ میں بنیادی طور پر فلسفہ کا طالب علم ہوں۔ شاعری میری پناہ گاہ ہے میں اس سے زیادہ کا دعویدار نہیں۔ میں نے ماضی اور حال میں جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا یا جو ان سے متعلق خیالات و افکار میرے ذہن میں پیدا ہوئے اور مستقبل کے بارے میں جو توقعات وابستہ کیں۔ میں نے انہیں شاعری کا لباس پہنانے کی حسبِ مقدور کوشش کی ہے اور اسی کاوش کو "آشوبِ میکدہ" کا نام دیا ہے۔ اس کتاب کا قاری خود فیصلہ کرے گا کہ یہ نام کہاں تک اپنی ذات میں اس کا جواز رکھتا ہے اور میں کہاں تک اس میں کامیاب رہا۔ اس سے پہلے کہ میں "حروفِ چند" کا اختتام کروں میری یہ اخلاقی ذمہ داری ہے کہ میں ان حضرات کا شکریہ ادا کروں جنہوں نے "آشوبِ میکدہ" سے متعلق

تمہاری مُحبّت مُحبّت نہیں
اگر خود سے تم کو رقابت نہیں
اگر اپنے دل میں مُحبّت نہیں
خلوصِ نظر کی ضرورت نہیں

ادب زندگی کی ضرورت ہوئی
وہی زندگی کا مہورت ہوئی
جو ختم اپنے دل کی ریاست ہوئی
مُحبّت کی اقلیم غارت ہوئی

اندھیرا فضا میں سرِ شام ہے
اجالا مگر منظرِ عام ہے
جو دل ہے وہ ٹوٹا ہوا جام ہے
مگر مست ہر بادہ آشام ہے

کتابوں کی اپنی نمائش کرو
خیالوں کی اپنے فزائش کرو
کبھی زندگی کی کشائش کرو
کبھی بندگی کی ستائش کرو

زمانے میں سب سے جدائی ہوئی
تمہاری یہ کیسی خدائی ہوئی

صلیبوں پہ انساں کو لایا گیا
نیابت کے منصب پہ پرکھا گیا

اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ میں جناب [illegible] صاحب نظر [illegible] ممنون ہوں [illegible]
ہے۔ پروفیسر عرش صدیقی (جو اب پروفیسر ڈاکٹر عرش صدیقی ہیں اور [illegible] بہاءالدین زکریا یونیورسٹی
ملتان) ان صاحب نظر لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے "آشوب میکدہ" پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی علم دوستی، ادب
پروری، حکمت و دانش کی ترویج اور سب سے بڑھ کر انسان دوستی کا ثبوت دیا ہے، وہ میرے لئے ظلمت میں
چراغ کی مانند ہیں میں ان کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ہر مرحلہ پر میری حوصلہ افزائی کی ہے۔
یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ پروفیسر ڈاکٹر عرش صدیقی نے میری تحریری درخواست پر "آشوب میکدہ" میں
مزید اضافہ کی وجہ سے اپنا "پیش لفظ" دوبارہ تحریر کیا ہے یہ تحریری درخواست صرف اس لئے کی گئی تھی کہ وہ
موجودہ حالات کی روشنی میں "آشوبِ میکدہ" پر بھرپور تبصرہ کر سکیں۔ میں اس سلسلے میں بھی ان کا انتہائی
ممنون ہوں۔ اس کے علاوہ پاک و ہند کے مشہور و معروف عظیم شاعر، مترجم، نقاد اور ممتاز مدیر جناب محترم
رفیق خاور "ماہ نو" کے سابقہ مدیر (جو اب بقیدِ حیات نہیں) کا بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے
اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود "آشوب میکدہ" پر قلم اٹھایا اور اپنے قیمتی تبصرے سے نوازا۔ میں ڈاکٹر
سید ابوالخیر کشفی صاحب پروفیسر شعبۂ اردو کراچی یونیورسٹی کراچی کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنی
علالت کے باوجود "آشوبِ میکدہ" پر اپنے قیمتی خیالات کا اظہار فرمایا۔ اس کے علاوہ میں محترم علامہ ڈاکٹر
برہان احمد فاروقی صاحب کا بھی خلوص دل سے ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں "آشوبِ
میکدہ" پر اپنے خیالات کو سپردِ قلم کیا۔ میں یہاں خاص طور پر سید سراج الدین موسوی مسئول خانۂ فرہنگ
جمہوری اسلامی ایران کراچی کا جو علم و ادب کا سرمایہ و وقار ہیں، شکر گزار اور ممنون ہوں کہ انہوں نے
اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود میری طویل نظم "آشوبِ میکدہ" پر اپنی قیمتی رائے کا اظہار فرمایا۔ میں
یہاں خصوصی طور پر آغا جعفر شاد پور زادہ ڈائریکٹر خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران ملتان کا جو حق و
صداقت اور عدل و انصاف کے پرستار اور اپنے عہد کے دکھ اور کرب سے آگاہ ہیں اور آغا شاہ رخ عرب
شاہی ڈپٹی ڈائریکٹر خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران ملتان کا جو زندگی اور اس کے مسائل پر گہری نظر رکھتے
ہیں اور اسلامی اور اخلاقی اقدار کی ترویج کے آرزو مند ہیں، تہہ دل سے شکر گزار اور ممنون ہوں کہ جن
کے پُر خلوص تعاون اور ہر مرحلے پر حوصلہ افزائی کی بدولت یہ کتاب "آشوبِ میکدہ" منظرِ عام پر آئی۔

پروفیسر ڈاکٹر صفدر حسین صفدر
"جادۂ خاموش"
93 - نصرت روڈ - ملتان چھاؤنی
ملتان

جب آدم کا پتلا بنایا گیا
فرشتوں سے سجدہ کرایا گیا

ہمارے لئے زندگی آگ ہے
یہ بدلا ہوا ساز میں راگ ہے
ہوس کی زمینوں پہ جو ناگ ہے
سمندر کی لہروں پہ وہ جھاگ ہے

تمدّن کی دیوی بھی بیباک ہے
ہوس دیکھ کر جس کو غمناک ہے
اب انساں کا چہرہ تہہِ خاک ہے
یہ منظر بہت ہی المناک ہے

وفاؤں کا دنیا میں محور نہیں
تو رِندوں کا گردش میں ساغر نہیں
سروں پر حیا کی جو چادر نہیں
تو روشن گھروں کا مُقدّر نہیں

بپا اپنے دل میں قیامت کرو
زمیں پر کوئی تم عدالت کرو
خدا سے خدا کی عنایات مانگو
کرم بہرِ ارض و سماوات مانگو

قیامت زمانے میں برپا کرو
روش سے زمانے کی جھگڑا کرو

حمدِ باری تعالےٰ

تو خالق ہے، مالک ہے، معبود ہے
ہر اک شے ترے کُن سے موجود ہے

تو دنیا میں ہے خالقِ کار ساز
ہر اک شے سے رہتا ہے تو بے نیاز

تو قہار ہے اور جبّار ہے
ہے غفّار تو اور ستّار ہے

تجھی سے ہے یہ عالمِ رنگ و بو
ہر اک شے میں ظاہر فقط تُو ہی تُو

نرالا ہر اک شے سے تیرا وجود
نہیں جس کی کوئی حدود و قیود

زمان و مکاں پر تصرّف ترا
زمانے کا ربّ ہے خدا ہے مرا

ملا تیرے دم سے عدم کو وجود
ہر اک شے کی طے کی ہیں تو نے حدود

ہے برق اور باراں میں جلوہ ترا
شرر میں گلستاں میں جلوہ ترا

کہ ادنیٰ و اعلیٰ و شاہ و فقیر
ہیں محتاج تیرے خدائے قدیر

مُحبت کے مکتوب لکھا کرو
مزا ہے جو خود کو بھی رسوا کرو

کہاں ہے زمانے میں اب اعتماد
ہے رقصاں ہمارے دلوں میں عِناد
دلاؤں گا تم کو کہاں تک میں یاد
مداوا ہے ہر زخم کا اب جہاد

میں بندہ ہی بندہ تمہی تم خدا
کہ روح و بدن سے نہیں ہو جُدا
لبوں پر ہمیشہ دعا ہو مرے
کسی زخمِ دل کی دوا ہو مرے

جو بندے سے میرا خدا بن گیا
وہ خواجہ کی اپنے قبا بن گیا
جو خود ہی صلیبِ وفا بن گیا
سرِ دار اپنی سزا بن گیا

یہ مومن کی دنیا میں پہچان ہے
کہ ہر حال میں وہ اک انسان ہے
نگاہوں میں میری پرستان ہے
اگرچہ مکاں دل کا ویران ہے

ہر اک گھر میں موجود قرآن ہے
نہ ہے دین لیکن نہ ایمان ہے

نہیں جن کو دنیا میں کوئی نظیر
وہ دنیا میں ٹھہرے ہیں تیرے سفیر

ترا دستِ قدرت ہے کتنا دراز
نہ اب تک کھلا ہے کسی پر یہ راز

قلم نے جھکایا ہے سجدے میں سر
کہ ہے ذات تیری جو پیشِ نظر

خدا کی ہے صفدر یہ تجھ پر عطا
قلم سے لکھی ہے جو حمد و ثنا

تعصّب پہ ہر چیز قربان ہے
بزرگوں کی اپنے عجب شان ہے

لبوں پر محمدؐ کا فرمان ہے
دلوں میں مگر رقصِ شیطان ہے
مسلماں کی دنیا میں کیا شان ہے
کہ ماضی ہی اس کی فقط جان ہے

بھرا سر میں نخوت کا سرطان ہے
ہر اک آدمی آج شیطان ہے

جو شاعر ہمارے لٹیرے ہوئے
بدن کی گلی میں سپیرے ہوئے
مقابر لٹیروں کے ڈیرے ہوئے
تمنّا کی باگوں کو پھیرے ہوئے

کوئی زخم سینے میں گہرا نہیں
کہ تیرِ نظر دل میں ٹھہرا نہیں
خلوص آشنا کوئی چہرہ نہیں
کسی کی جبیں پر یہ سہرا نہیں

تمہیں فطرتاً مجھ سے نفرت ہوئی
مجھے عادتاً تم سے اُلفت ہوئی
کسی دن جو پیدا شکایت ہوئی
حقیقت بھی اپنی حکایت ہوئی

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

قلم سے رقم ہو جو نعتِ رسولؐ
مرا عجز ہو اُس کے در پر قبول
کہا ہے جنہیں تو نے اپنا حبیب
مجھے در ہو ان کا خدایا نصیب
ادا فرض کیسے ہو توصیف کا
زباں میری عاجز ہے بہرِ ثنا
محمدؐ پہ بھیجو درود و سلام
لبوں پر رہے بس محمدؐ کا نام
جو ہے صدقِ دل سے نبیؐ پر فدا
رہے مہرباں اس پر دائم خدا
محمدؐ ہیں امت کے مشکل کشا
خدا نے یہ منصب کیا ہے عطا
رسولِ خدا ہیں حبیبِ خدا
بنے جن کے باعث یہ ارض و سما
ہے صفدر حبیبِ خدا پر نثار
خطا بخش دے، میری پروردگار

شباب اُن پہ آیا قیامت ہوئی
جواں اور اپنی مُحبتّ ہوئی
سہارا ہمارا اناؤں پہ تھا
یہ جنگل میں منگل صداؤں پہ تھا
قناعت کا دامن دعاؤں پہ تھا
یہ ہنگامہ دل کا نواؤں پہ تھا

کہاں پر خدا کی خدائی نہیں
کہاں تک نبیؐ کی رسائی نہیں
اجل بھی یہاں کام آئی نہیں
لبوں پر ہمارے دُہائی نہیں

لہو ہے رگِ سنگ میں اب رواں
ہوئی ہے بغاوت دلوں میں جواں
کوئی بات اپنی نہیں ہے نہاں
ہے برباد ہاتھوں سے اپنا جہاں

ہے رقصاں غزل آج ایران میں
نہیں کوئی جبراؔن لبنان میں
عیاں ہے حقیقت یہ وجدان میں
ملے گا خدا ہم کو انسان میں

فلسطینیوں کا وطن بھی نہیں
اور اس کا علاجِ محن بھی نہیں

پرندوں کا کوئی چمن بھی نہیں
گلستاں میں سرو و سمن بھی نہیں

سرِ طور جلوہ دکھایا گیا
چراغِ محبت جلایا گیا
بتوں کے سروں کو جھکایا گیا
حرم بُت کدے کو بنایا گیا

ابھی ظلمتوں کا یہاں راج ہے
اندھیروں کا سر پر ابھی تاج ہے
زمیں پر زمانے کا حجّاج ہے
میسّر ابھی کس کو سوراج ہے

نہ جنت میں اپنی وہ شدّاد ہے
نہ فن کا یہاں کوئی بہزاد ہے
یہاں جو پرندہ ہے آزاد ہے
چمن آلۂ کارِ صیّاد ہے

نکلنے کا جنت سے چرچا نہیں
کہ دنیا میں کوئی بھی رسوا نہیں
ازل کے لبوں پر بھی نغمہ نہیں
ابد کی یہاں کوئی سنتا نہیں
گرا جو یہاں پر سنبھلتا نہیں
سنبھلنے کی صورت وہ سنبھلا نہیں

زمیں پر قیامت بپا ہوگئی
مروّت ہماری خطا ہوگئی
نماز محبّت ادا ہوگئی
محبّت ہی اپنا خدا ہوگئی

گراں خواب انساں سنبھلنے لگا
جب اپنے قدم پر وہ چلنے لگا
مذاہب کے عنواں بدلنے لگا
کوئی ناگ سینے میں پلنے لگا

اُخوّت کا چشمہ ابلنے لگا
مُحبّت کا طوفاں مچلنے لگا

جہنم ہے دھرتی پہ ایتھوپیا
کہ اپنا بدن آگ جس نے کیا
بنا مسئلہ ایک کمبوڈیا
سہارا اسے کس نے آکر دیا

گھِرا یوں مظالم میں کشمیر ہے
کہ اس کی نظر سوز تصویر ہے
یہ غاصب کی دنیا میں جاگیر ہے
یہ ظلمت کے ماتھے کی تحریر ہے

لبوں پر جو لفظوں کی شمشیر ہے
وہ تعبیر میں نشتر و تیر ہے

صنم پتھروں سے تراشے گا کون
کہ ویران معبد میں جائے گا کون
روایت کا ایوان ڈھائے گا کون
اور اپنا خدا بنائے گا کون

بہر حال طوفاں گزر جائے گا
سمندر کا چہرہ نکھر جائے گا
کبھی تو یہ انسان گھر جائے گا
مد و جزر اس کا اتر جائے گا

اگرچہ کہ مدت سے بارش نہیں
ہوا کی یہاں کوئی سازش نہیں

جو دہقان کھیتوں کے مالک ہوئے
ہماری نظر میں وہ سالک ہوئے

مری زندگی کا عجب روپ ہے
کہیں چھاؤں ہے اور کہیں دھوپ ہے
تخیّل کا اک یہ بھی بہروپ ہے
اور انسان کی فکر کا توپ ہے

ملی ہے برہنہ مجھے زندگی
یہ ظلمت ہے میرے لئے روشنی
وفا کی نہیں شہر میں کچھ کمی
مگر اس سے محروم ہے آدمی

سرِ دار جو بات ہم نے کہی
حقیقت سمجھ کر وہ کس نے سنی
حقیقت ہے رقصاں مرے سامنے
ہے جذبوں کا طوفاں مرے سامنے
لُٹا ہے گلستاں مرے سامنے
ہے خاموش یزداں مرے سامنے
ادب ہے پریشاں مرے سامنے
کہ اجڑا دبستاں مرے سامنے

کوئی ہم پہ گرچہ عنایت نہیں
مگر لب پہ کوئی شکایت نہیں
بزرگوں کو کوئی ہدایت نہیں
جوانوں کی کوئی روایّت نہیں
بغاوت بھی کوئی بغاوت نہیں
عدالت میں کوئی عدالت نہیں
امیروں میں کوئی سخاوت نہیں
سخاوت کی جیسے ضرورت نہیں

مجھے موت بڑھ کر گلے سے ملی
رگوں میں لہو کی حرارت بڑھی
ترقّی جو وجہِ تنزّل ہوئی
وہ ناکامیوں کا فسانہ بنی

ادب میں جنہیں مجھ سے نفرت رہی
مجھے ان سے پھر بھی محبّت رہی
مرے دل میں نفرت بھی چاہت رہی
تمہیں پھر بھی مجھ سے رقابت رہی

رذالت بشکلِ شرافت رہی
شرافت کے رُخ پہ ندامت رہی

صلیبِ قلم پر ہیں اہلِ قلم
ادب کی ہے ان پر نگاہِ کرم
تراشا جو ہم نے ادب کا صنم
کیا اس میں تخیّل کا حسن ضم

نہ ہو میکدے میں اگر کوئی غم
تو بن جائے تریاق مانندِ سم

چمن میں جو اپنے بہار آئے گی
لہو سے وہ شاخیں نکھار آئے گی
یہ کشتی بھی طوفاں سے پار آئے گی
ہوا جب کوئی ساز گار آئے گی

جو خود کو محبّت پہ وار آئے گی
وہ زلفِ پریشاں سنوار آئے گی

روایت جو اُلفت کی چل جائے گی
جوانوں کی حالت بدل جائے گی

جو طبعِ زمانہ سنبھل جائے گی
روایّت بھی جدّت میں ڈھل جائے گی

ترا قول ہم مان تو لیں مگر
نہ ہو شام تو پھر کہاں کی سحر
بدلتی ہے قوموں کو اب بھی نظر
عمل میں جو شامل ہو خونِ جگر

نگاہوں میں اب انقلاب آئے گا
کہ گزرا ہوا پھر شباب آئے گا
سوالوں کا اپنے جواب آئے گا
عمل کا ہمارے حساب آئے گا

غَرَض چاہیئے کچھ نہ انجام سے
سروکار رکھوّ فقط کام سے
نکلیئے اندھیروں کے کُہرام سے
ہے ظلمت کا سایہ سرِ شام سے

جو بزم اُخوتّ سجائیں گے لوگ
محبت کی دنیا بسائیں گے لوگ
چراغ محبت جلائیں گے لوگ
کدورت دلوں سے مٹائیں گے لوگ

ندامت کا احساس تمہید ہے
ثقافت مُحبتّ کی تجدید ہے

زمانے میں باطل کی تردید ہے
خدا کی طرف سے یہ تائید ہے
یتیموں کے چہرے دمکنے لگے
پرندے فضا میں چہکنے لگے
زمیں پر جو ذرّے چمکنے لگے
مروت کے شعلے دہکنے لگے
مرے دن بھی دیکھو گزر جائیں گے
وہ خوشبوں سے دامن کو بھر جائیں گے
جو خانہ بدوش اپنے گھر جائیں گے
مقدّر بھی ان کے سَنور جائیں گے
بُرے کو گلے سے لگاؤں گا میں
کہ غیروں کو اپنا بناؤں گا میں
کسی در پہ سر کو جھکاؤں گا میں
یہ تیرِ ملامت بھی کھاؤں گا میں
جوانوں کو رستہ دکھاؤں گا میں
صداقت کے معبد میں لاؤں گا میں
رموزِ محبت بتاؤں گا میں
حقائق سے پردہ اٹھاؤں گا میں
درِ میکدہ بھی کھلے گا کبھی
یہ دورِ عنب بھی چلے گا کبھی

فلک ہاتھ اپنے ملے گا کبھی
جو دیپک لہو سے جلے گا کبھی
مُحبتّ کا چولا نہ پہنا کبھی
اُخوتّ کا دامن نہ پکڑا کبھی
بنے ہو کسی کا سہارا کبھی
کوئی دکھ کسی نے نہ پوچھا کبھی

تقاریر میں اب بڑا زور ہے
مساجد میں برپا بہت شور ہے
نگہباں بھی دنیا میں اب چور ہے
شریفوں کا رہبر بھی کمزور ہے

زمانے میں کہتے ہیں جس کو خدا
وہی ابتدا ہے وہی انتہا
کہا جس نے اک حرفِ کن برملا
دلوں میں وہ رہتا ہے بن کر انَا

کہاں کوئی بندوں میں مردِ خلیل
جہاں میں بنے جو خدا کی دلیل
ہُوا جب سے قاضی زمیں پر ذلیل
گیا ہاتھ سے اس کے صبرِ جمیل

بدلنے لگا ہے ہمارا مزاج
ادا آج ہونے لگا ہے خراج

نہیں میرے زخموں کا کوئی علاج
معالج بنا ہے اگرچہ سماج
نصابِ وفا جو بدلنے لگے
محبّت کے رستے نکلنے لگے
گلستاں جو شبنم میں جلنے لگے
خزاں کا لہو منہ پہ ملنے لگے
کہ نیکو گلے سے لگا لو مجھے
برائی کی زد سے بچالو مجھے
میں اک رند ہوں یوں نہ ٹالو مجھے
درِ میکدہ پر سنبھالو مجھے
کبھی داس اپنا بنالو مجھے
خلش سے بدن کی نکالو مجھے
نہ بازار میں یوں اُچھالو مجھے
اُخوّت کے سانچے میں ڈھالو مجھے
چراغِ وفا ہوں جلا لو مجھے
اور آنکھوں میں اپنی بٹھالو مجھے
وہ دیکھو افق پر سحر ہوگئی
اِدھر کی یہ دنیا اُدھر ہوگئی
فلک سوز کس کی نظر ہوگئی
زمیں جس سے زیر و زبر ہوگئی

مری زندگی اک شرر ہوگئی
خیالات کا مستقر ہوگئی

ہے خاموش دنیا میں تاریخ ساز
رہی ہے حقیقت ہمیشہ ہی راز
کنویں میں گرا فکر کا شاہباز
کہاں ہیں بلندی کے فخر اور ناز

اندھیروں میں آکر جلاؤ چراغ
بدل جائیں گے ظلمتوں کے دماغ
دکھائے نہ کوئی ہمیں سبز باغ
کہ ملنے کا اپنا نہیں اب سُراغ

ازل سے خدا کا ہوں میں ہمرکاب
فرشتوں سے کرتا ہوں میں یوں خطاب
اب آیا ہے شعلوں پہ ایسا شباب
اترنے لگی ہے تقدس کی آب

ڈراتا نہیں ہے کسی کو عذاب
اگرچہ ہوا ہم پہ نازل عتاب
کہیں منتظر ہے نیا انقلاب
ہیں قرطاس پر اب سوال و جواب

سرِ میکدہ ہوگئے دل کباب
کہ بٹنے لگی ہے لہو کی شراب

دما دم تمناؤں کا وار ہے
دل و جاں پہ حسرت کی یلغار ہے
تمنّا جو اپنی نویلی ہوئی
ہر اک شے اس کی پہیلی ہوئی

وفاؤں کی دیوی اکیلی ہوئی
مری زندگی پھر سہیلی ہوئی
غریبوں پہ غُصّہ برسنے لگا
امیروں کو جب ناگ ڈسنے لگا

جو سانپ آستینوں میں پلنے لگا
وہ ڈسنے کی خاطر مچلنے لگا
سرِ دشت چشمہ ابلنے لگا
پہاڑوں سے دریا نکلنے لگا

جو فکر و عمل میں بغاوت ہوئی
سر دار ہم پر عنایت ہوئی
بخیلوں کے ہاتھوں سخاوت ہوئی
تو سخیوں کو اس پر ندامت ہوئی

وہ کہتے ہیں ان کو خدا مان لو
خودی سے خدا کو جدا مان لو
سرِ دار اپنی خطا مان لو
وفا کرکے جرمِ وفا مان لو

جو آدم کی عظمت جتانے لگے
لہو وہ زمیں پر بہانے لگے
جو محفل سے اُٹھ اُٹھ کے جانے لگے
تو محفل پہ سو رنگ آنے لگے

جو صحرا کو گلشن بنانے لگے
وہ خاروں سے دامن بچانے لگے
جو ساغر پہ ساغر چلانے لگے
دیئے سے دیا وہ جلانے لگے

جو خوابوں میں وہ آنے جانے لگے
تو خوابیدہ جذبے جگانے لگے

نئی بستیاں اب بسائیں گے ہم
پرانے سب ایوان ڈھائیں گے ہم
محبت کے دیپک جلائیں گے ہم
ہر انساں کو انساں بنائیں گے ہم

سبھوں کو گلے سے لگائیں گے ہم
شکایت زباں پر نہ لائیں گے ہم

صحافت وہ کوئی صحافت نہیں
اگر اس میں شامل صداقت نہیں
عدالت وہ ہرگز عدالت نہیں
کہ دستور کی جس میں عظمت نہیں

کسی کی خدا سے عداوت نہیں
کہاں پر عیاں اس کی رحمت نہیں
محبّت کی جس میں حرارت نہیں
شعورِ جمال اس کی قسمت نہیں

اگر دل میں انساں کی الفت نہیں
تو دنیا کو میری ضرورت نہیں

کبھی غیر جانب جو تکتا نہیں
وہ راہوں سے اپنی بھٹکتا نہیں
جو شعلوں کی جانب لپکتا نہیں
کسی موڑ پر وہ جھجکتا نہیں

نظر سے لہو اب ٹپکتا نہیں
کہ خاروں میں دامن اٹکتا نہیں

صداقت کی ناگن ہے بپھری ہوئی
لہو سے ہمارے ہے نکھری ہوئی

اگرچہ سفر سے بدن چور ہے
مگر منزل اپنی ابھی دور ہے
جو ظلمت میں احساس کا نور ہے
وہ اپنے لئے جلوۂ طور ہے

زمانے پہ تازہ ستم کیجئے
کبھی یہ نگاہ کرم کیجئے

حقیقت لہو سے رقم کیجیے
سروں کو ہمارے قلم کیجیے

کلیسا و مندر بھی ویران ہیں
مساجد میں روحیں پریشان ہیں
مورّخ زمانے کے حیران ہیں
ثقافت کے ایوان سنسان ہیں

ابھی رات ہے کچھ سویرا نہیں
افق پر نظر کے اندھیرا نہیں
ابھی اوج پر ذہن پہنچا نہیں
حقائق کا رخ تو نے پھیرا نہیں

ادب میں دلوں کا دلستاں نہیں
وفاؤں کا دنیا میں عنواں نہیں
الجھنے کا خاروں سے امکاں نہیں
کہ صحرا میں کوئی گلستاں نہیں

سرِشکوں کو شعلے سمجھتے ہیں ہم
کہ جنت سے اپنی نکلتے ہیں ہم
ہر اک بات دنیا کی سہتے ہیں ہم
لہو بن کے رگ رگ میں بہتے ہیں ہم

بچھائی زمیں پر اندھیروں نے رات
فلک سے اجالوں کی اتری برات

برہنہ ہوا چہرۂ کائنات
رہی پھر بھی پردے میں پردے کی بات
بتوں پہ ہیں گرچہ خدا کی صفات
دلوں میں ہیں خواہش کے لات و منات

ازل سے ہے دونوں [illegible] جستجو
رگِ ارتقا میں کہاں ہے لہو
چلی جب سے پھولوں میں شبنم کی لو
گلستاں کے آنگن ہیں بے رنگ و بو

جو سورج بدن سے چمکنے لگے
تمازت سے باطن کی تپنے لگے
جو اشکوں سے رخسار جلنے لگے
تو دامن کے سائے سرکنے لگے

ازل سے خدا کا یہ دستور ہے
کہ مختار انساں بھی مجبور ہے
ہر اک فیصلہ جس کا منظور ہے
مٹانا ہمیں اس کا منشور ہے

الٹ دوں گا میں اس کے رخ سے نقاب
جب اٹھ جائے گا درمیاں سے حجاب
مرا منتظر ہے کوئی انقلاب
کہ ہر روز ہے مجھ کو یومِ حساب

مرے ذہن میں کوئی وحشت نہیں
بیاں میں میرے گرچہ صحت نہیں
میں پیتا ہوں جامِ نظر سے شراب
کہ نازل نہ ہو مجھ پہ کوئی عتاب

نہ روحوں کی جنّت ہمیں آئی راس
سمندر میں رہ کر بھی باقی ہے پیاس
ثقافت کے تن پر نہیں ہے لباس
گناہوں کے چہرے پہ رقصاں ہے یاس
فنونِ لطیفہ بنی زندگی
کہ رسمِ وفا بھی نہ رسما" چلی

کرے کیا کسی سے شکایت کوئی
کہ اب ہر ستم ہے کرم گستری
نئی نسل دنیا میں بدنام ہے
گناہوں کی دعوت سرِ عام ہے
بزرگوں کی ہر بات ناکام ہے
نصیحت کا ہاتھوں میں گو جام ہے

عَبث حسنِ یوسف پہ الزام ہے
نظر کی زلیخا لبِ بام ہے
نصاریٰ کے ہاتھوں میں انجیل ہے
یہ ظلمت کی دھرتی پہ قندیل ہے

یہ قرآں مذاہب کی تکمیل ہے
ہر اک چیز کی اس میں تفصیل ہے

نگاہوں میں یہ عین تکمیل ہے
زمانہ بھر آن تبدیل ہے

مقدس ہے ویدوں[1] میں گیتا[2] بڑی
گلستاں کے پھولوں میں ہے وہ کلی
یہ رسمِ وفا بھی انہیں سے چلی
کہ روحوں کو راحت انہیں سے ملی

جو توریت موسیٰ پہ نازل ہوئی
وہ تھا اصل میں مصحف مذہبی
یہودی کو اس سے ملی زندگی
سُنی تھی نہ موسیٰ کی جس نے کبھی

رقابت بزرگوں میں بڑھنے لگی
نفس کی ہوا تیز چلنے لگی
نظر اپنی رہ سے جو مُڑنے لگی
سرِ میکدہ خاک اڑنے لگی

1۔ ویدوں کا تعلق رسمی عبادت سے ہے۔

2۔ بھگوت گیتا کا تعلق جذبات کے ساتھ علم و عمل سے ہے۔ بھگوت گیتا ہندوؤں کی مقدس کتاب ہے ۔ مہابھارت کا ایک حصہ ہے۔

کہاں ہیں وہ پہلے سے صحرا نشیں
تھی بے داغ دنیا میں جن کی جبیں
وفائیں ہماری صلیبیں بنیں
جہنم بنی ہے ہماری زمیں

تراشے ہیں پتھّر سے کتنے صنم
کیا تیشۂ فن سے ان کو قلم
سہارا ہیں اپنے یہ رنج و الم
میسّر کہاں اب تمہارے ستم

یہی مجھ کو غم ہے نہیں کوئی غم
کہ غم ہی سے ہے زندگی کا بھرم
حسینوں کا مجھ پر ہے پھر بھی کرم
اگرچہ حسیں ہیں سراپا ستم

مئے چشمِ ساقی اگرچہ ہے سم
سمجھتے ہیں اس کو بھی تریاق ہم
خوشی بھی غریبوں کی ہے پُر الم
اسے دیکھ کر کیوں نہ ہو آنکھ نم

یہ مندر یہ مسجد نشانِ اماں
اُخوّت کے گویا ہیں دریا رواں
کلیسا و ہیکل خدا کے نشاں
یہاں نفرتیں ہیں دلوں میں جواں

لبوں پر خدا کے ہے آہ و فغاں
لگائے ہیں آدم نے ڈیرے کہاں

اذانوں کی ہے گونج دھنوں میں آج
یہ وحشت ہے رقصاں مکانوں میں آج
نہیں ملی غیرت جوانوں میں آج
ٹھکانہ کہاں ہے ٹھکانوں میں آج

نہ ہے باپ کوئی نہ فرزند ہے
نہ آزاد کوئی نہ پابند ہے
تمہیں دستِ قاتل کی سوگند ہے
کہ دنیا کے مقتل میں آنند ہے

جہاں میں مری زندگی ریل ہے
مرا یہ بدن روح کی جیل ہے
سیاست زمانے میں اک کھیل ہے
کمینوں شریفوں میں اب میل ہے

ملا جب ہمیں گلشنِ اقتدار
خزاں کو سمجھنے لگے ہم بہار
کوئی حسنِ عالم نہیں پائیدار
کہ آتا ہے جوبن کہاں بار بار

مرے ہاتھ میں ہے گلوں کا سنگار
گلے سے نہ اترے گا کانٹوں کا ہار

کناروں پہ دریا کے اب جھاگ ہے
کہ ہر لہر خواہش کا اک ناگ ہے
بدن کے لبوں پر کوئی راگ ہے
کہ سینے میں نغمات کی آگ ہے

خدا کی جو بندوں پہ رحمت ہوئی
زمیں پر فلک کی عنایت ہوئی
غلاموں میں جب سے بغاوت ہوئی
تو قدرِ اُخوتّ بھی غارت ہوئی

مقام اپنا رکھتا ہے علم الکلام
ملا اس کو مغرب میں اعلیٰ مقام
ادب سے وہ لیتا نہیں اس کا نام
کہ مشرق کو اس سے غرض ہے نہ کام

نہ آیا کبھی کام اپنا قیاس
ہے منطق کی مے سے یہ خالی گلاس
کہاں تک بنے گی سہارا یہ آس
کہ مل جائے گا سیم و زر کا لباس

تری دشمنی آج رحمت ہوئی
کہ میری وفا حرفِ زحمت ہوئی
تری بے رخی مجھ کو نعمت ہوئی
کہ اس سے خیالوں کی صحت ہوئی

سرِ دار ان کو بلانا نہیں
کوئی بات ان کو بتانا نہیں
یہ احساں کسی کو جتانا نہیں
حدیثِ وفا لب پہ لانا نہیں

غلاموں سے بڑھ کر قیصر بنے
جو رہزن تھے وہ آج رہبر بنے
جو ظالم تھے مظلوم پیغمبر بنے
جو محتاج تھے، بندہ پرور بنے

جو روحوں کی دنیا میں سرور بنے
سروں سے کبھی ان کے ممبر بنے

جو مکتب میں سفّاک استاد تھا
پریشان رنگوں میں بہزاد تھا
کبھی کہکشاں میں جو آباد تھا
وہ تاروں کی چھاؤں میں برباد تھا

ادب کی جو میرے نمائش ہوئی
تو افکار کی بھی ستائش ہوئی

مرے حال پر جب وہ ہنسنے لگے
تو وحشت کے سائے بھی ڈسنے لگے
مرا خط وہ پڑھ کر برسنے لگے
سرِ بزم بادل گرجنے لگے

اب انسان انساں سے بدظن ہوا
جو رہبر تھا اپنا وہ رہزن ہوا
نفس جو جہالت کا مخزن ہوا
فضائل کا ہر ذہن مدفن ہوا

یہ مشرق یہ مغرب میں تنہا ابھی
نہیں ہیں محبّت میں یکتا ابھی

اجالوں کی دنیا میں اندھیر ہے
کہ انساں فقط خاک کا ڈھیر ہے
ہر اک موڑ پر عقل کا پھیر ہے
کہ آنے میں رہ پر ابھی دیر ہے

تھے رحمت کے مرکز کبھی جو مزار
بنے وہ تماشائے لیل و نہار
کہاں آدمی کے لئے ہے قرار
ازل کا ابد تک رہے گا خمار

ہے صحرا میں ابتک وہ اختر شمار
جسے ہم سمجھتے تھے ادنیٰ گنوار

جو چینی زمانے میں بیدار ہیں
تو روسی زمانے کے غمخوار ہیں
ہم امریکیوں کے نمک خوار ہیں
مگر اپنی ملّت پہ ہم بار ہیں

ہم انسانیت کے طرفدار ہیں
اگرچہ سرِ دست بیکار ہیں

مانا ہم کو مغرب سے علم و ہنر
ہمارا ہی اس میں ہے خونِ جگر
ادب پر ہماری ہے گہری نظر
کہ فن کا ہے سہرا ادیبوں کے سر

جو مسلم کبھی اس کے وارث رہے
وہ بن کر زمانے میں حارث رہے

سوالوں سے دامن بچانے لگے
حقائق سے آنکھیں چُرانے لگے
جو ماضی کے اب گیت گانے لگے
وہ آدم کا قِصّہ سنانے لگے

جو ماضی کی عظمت جتانے لگے
وہ حالات کا خوں بہانے لگے

جو واعظ ہے منبر پہ فن کار ہے
ریا کار ہے اور مکار ہے
ضمیروں میں جس کی یہ جھنکار ہے
وہ پازیب کتنی طرحدار ہے

زمانے میں لعنت ہے اب قیصری
میسر ہے کس کو یہاں سروری

ہراساں ہے ساغر میں اب جل پری
حسینوں کو آتی نہیں دلبری
میں کرتا ہوں باتیں ہمیشہ کھری
کہ پیشہ نہیں ہے مرا شاعری

طوائف سے مجھ کو عقیدت ہوئی
عقیدت برنگِ عبادت ہوئی
سرِ شہر رسوا شرافت ہوئی
کہ دیکھا تمہیں خود سے نفرت ہوئی

مری زندگی اک قیامت ہوئی
نہ اس پر بھی مجھ کو قناعت ہوئی
جو قائم زمیں پر عدالت ہوئی
سرِ آسماں اس کی شہرت ہوئی

یہ مانا طبیعت میں اوباش ہوں
مگر فطرتاً ایک قلّاش ہوں
کوئی بات تم سے چھپاتا نہیں
میں تالی بھی لیکن بجاتا نہیں

میں گو بات کرنے میں بیباک ہوں
مگر اصل میں چشم نمناک ہوں
لہو جام میں آکے صہبا ہوئی
جب آنکھوں میں آئی تو عنقا ہوئی

شرارے نظر سے بکھرنے لگے
قیامت کے طوفاں گزرنے لگے

جو دن دختِ رز کا منایا گیا
لہو ساغروں میں پلایا گیا
حرم میں مُغنّی کو لایا گیا
وہاں نغمہ دیر گایا گیا

طوائف کی نیکی جو لعنت ہوئی
تو اس کی بدی وجہِ رحمت ہوئی

سرِ حشر اُمتّ کو بخشا گیا
محمدؐ نے اس کو جب اپنا کہا

خلوصِ وفا کا زمانہ نہیں
یہ ہے اک حقیقت فسانہ نہیں
کہیں روح کی چھاؤں ملتی نہیں
کلی اپنے جسموں کی کھلتی نہیں

کہوں کیا ابھی کیا سے کیا ہوگیا
کہ بندے سے کوئی خدا ہوگیا
مرا سر جو تن سے جدا ہوگیا
میں اندھے کنویں کی صدا ہوگیا

ہر اک شخص میں ہے ابھی خود سری
نہ دے گی مگر کام یہ سرکشی

جو حکمت کے در سے ہیں بھاگے ہوئے
وہ سوئے ہوئے ہیں نہ جاگے ہوئے

نہ مخلوق خالق سے مایوس ہے
نہ خالق ہی بندوں سے مانوس ہے
غزل اپنی سازوں کی ناموس ہے
ربابِ بدن کی وہ فانوس ہے

بھلائی کا ہاتھوں میں قاموس ہے
یہ انساں مگر اپنا جاسوس ہے

مذاہب کا دل میں بکھیڑا نہیں
کہ سازِ ازل میں نے چھیڑا نہیں

اگرچہ ہوس مجھ پہ بہتان ہے
مُحبّت مگر میرا ایمان ہے
خدا و محمدؐ کا فرمان ہے
مُحبّت ہی مضمونِ قرآن ہے

جب انسان انساں سے مل جائے گا
کنول آرزوؤں کا کھل جائے گا
جب اپنا کوئی زخم سل جائے گا
وہ بن اک تمنائے دل جائے گا

جو نفرت کی دیوار گر جائے گی
تو قسمت بھی انسان کی پھر جائے گی

اُخوّت کی دلہن جدھر جائے گی
فضا کی فضا ہی نکھر جائے گی
نہ باقی رہے گا کوئی فاصلہ
نہ ٹھہرے گا رہ میں کوئی قافلہ
زمانے میں ہر سمت انسان ہیں
جو انساں نہیں ہیں وہ شیطان ہیں
مذاہب کا مطلب لڑائی نہیں
کہ اس میں کسی کی بھلائی نہیں
نقوشِ ثقافت مٹانا نہیں
کہ معبد کسی کا بھی ڈھانا نہیں
قریب آکے انساں کیوں دور ہے
عناصر کے ہاتھوں سے مجبور ہے
جو انسان جنّت سے مفرور ہے
وہ دوزخ کی بانہوں میں محصور ہے
ریاکاریوں میں جو مشہور ہے
وہ ماتھے پہ انساں کے ناسور ہے
لہو پی کے اپنا جو مخمور ہے
وہ کب جام و مینا سے مسرور ہے
نظر جو اجالوں سے معمور ہے
یہ ظلمت بھی اس کے لئے نور ہے

مجھے یاد ہیں وہ ہوس ناکیاں
کسی کی وہ خلوت میں بیباکیاں

جہاں میں جو سردارِ اقوام ہیں
عدالت کی دنیا میں بدنام ہیں
جہاں پر مباحث سرِ شام ہیں
وہاں رقص میں خون کے جام ہیں

مسائل پہ دنیا کے ہے تبصرہ
جنیوا ہے مرکز کبھی انقرہ

زمیں پر نہیں کوئی تاریخ ساز
مگر پھر بھی آپس میں ہے ساز باز

کوئی قوم ان سے نہ آزاد ہے
لبوں پر کسی کے نہ فریاد ہے

جو امریکہ دنیا میں ممتاز ہے
تو افریقہ پس ماندہ اک باز ہے
نہ دنیا میں کوئی انا ساز ہے
نہ دمساز کوئی نہ ہم راز ہے

جو شعلے برستے ہیں لبنان میں
لہو سرد ہے آج جبران میں
شکایت ہے لوگوں کو ایران میں
مُحبّت نہیں کوئی افغان میں

مسائل کا دل تو ہے قرآں میں
حرارت نہیں پھر بھی ایمان میں

لہو سے ہے رنگین ایتھوپیا
کسی نے نہ اس کو سہارا دیا
ہے زخمی زمانے میں صومالیہ
نہ زخم اس کا اب تک کسی نے سیا

جو کمبوڈیا اب لب بام ہے
تو ویت نام کے پاس نیپام ہے

مظالم کی زد پہ فلسطین ہے
دل اس کا افسردہ ہے غمگین ہے

رہیں وہ جہاں ان کا مسکن ہے وہ
مریں ۔ وہ جہاں ان کا مدفن ہے وہ

ہے جاری زمانے میں جنگ و جدل
نہ ہاتھ آیا انساں کو اس کا بدل

غلامی کے شعلوں میں کشمیر ہے
اک آتش نما اس کی تصویر ہے

نصاریٰ و مسلم پریشان ہیں
وہ آپس میں دست و گریبان ہیں

بظاہر تو فلپائن آزاد ہے
فرنگی مگر اس کا صیاد ہے

ہیں یونان و ترکی بھی الجھے ہوئے
شرابی ہوں جس طرح بہکے ہوئے
کہاں فارموسا کو حاصل سکوں
کہ ہے چین کے سر میں اس کا جنوں

وہ اک دوسرے کے جو قاتل ہوئے
کبھی صلح پر وہ نہ مائل ہوئے
یہ اِزموں کے موجد بھی جاہل ہوئے
کب اپنے عقیدوں کے عامل ہوئے
وہ انساں کی صفت میں نہ شامل ہوئے
نہ انسانیت کے ہی قائل ہوئے

ہماری محبّت خیالی نہیں
کسی در پہ دیکھو سوالی نہیں
فلک نے مری بات ٹالی نہیں
حقیقت کی آغوش خالی نہیں
اگرچہ بظاہر شرابی ہوں میں
مگر شاعرِ انقلابی ہوں میں

نظر میں تمہاری گنہگار ہوں
میں انساں کا پھر بھی طرفدار ہوں
سرِ موجِ دریا بھرتا رہا
میں صحنِ بدن میں بکھرتا رہا

جو پہلو میں شعلہ بدن آ گئی
تو ماتھے پہ شب کے شکن آ گئی

کسی غیر کو اپنا سمجھا نہیں
اور اپنوں کو اپنا بتایا نہیں

مروّت میں سب کچھ نبھانا پڑا
محبّت کے کعبے کو ڈھانا پڑا

اگر کوئی صورت ہو زیرِ نقاب
نظر آئے اس کا کہاں پھر جواب
غرض سے کسی کو نہیں اجتناب
کہ ہر ہاتھ میں ہے غرض کی کتاب

بزرگوں کی باقی نہیں اب کوئی آب
نئی پود ہونے لگی ہے خراب
جو دیکھا ہے تاریخ کا ہم نے باب
نظر آیا ہر موڑ دارلعذاب

کوئی عصرِ نو میں مجدّد نہیں
مٹائے جو دنیا سے اکبر کا دیں

محبّت کی دنیا سے جو دور ہیں
تقدّس پہ اپنے وہ مغرور ہیں

ہر اک بات ان پر گراں ہوگئی
حقیقت جب ان کی عیاں ہوگئی

وہ پل کر لہو سے جواں ہوگئی
تمنّا جو آہ و فغاں ہوگئی
تمدّن کی دیوی لُٹی بارہا
اور آدم کی عظمت گھٹی بارہا

جو حاصل ہو انسان کو ارتقا
اسی میں ہر اک چیز کی ہے بقا
ہے قانون فطرت کشا کش سدا
تنازع میں پنہاں ہے خیرالبقا

چمن میں جو چلتی ہے بادِ صبا
وہ پھولوں میں رکھتی ہے اپنی انا
جو دریا کی لہریں اترنے لگیں
وہ ساحل کے زخموں کو بھرنے لگیں

جو سورج کی کرنیں بکھرنے لگیں
تو پھولوں کی شاخیں سنورنے لگیں
بنا کر مٹانے کا دستور ہے
مٹا کر بنانے کا منشور ہے

جو لفظوں کی بجلی گرانی لگے
وہ گلزارِ معنی جلانے لگے
لہو فکر کا جو بہانے لگے
حریمِ ادب کو وہ ڈھانے لگے

تری راہ سے یوں گزرتا رہا
ہر الزام خود پر میں دھرتا رہا
مجھے کچھ صفائی میں کہنا نہیں
کسی کی غلط بات سہنا نہیں
خطا اس کی پہلے بتا دیجئے
خطا کار کو پھر سزا دیجئے
جو مجھ سے ہوا در گزر کیجئے
عنایت کی مجھ پر نظر کیجئے
حقیقت میں ہے وہ زمیں آسماں
ہو اللہ کی جس سے قدرت عیاں
جو کرتا ہے اپنے فضائل بیاں
اُخوّت کے اس میں خصائل کہاں
شرار چمن سے نہ دامن بچا
یہ ہیں زخمِ دل ان سے محفل سجا
تو قاتل کو بڑھ کر گلے سے لگا
گلہ کر نہ اس سے کبھی قتل کا
وہ کہتے ہیں فطرت بدلتی نہیں
خدا کی مشیت بدلتی نہیں
جو پہلی سی اس میں مروّت نہیں
طوائف کے پہلو میں راحت نہیں

خودی چھا گئی اپنے ایمان پر
گراں خود فریبی ہے وجدان پر

ہواؤں میں رقصاں جو انسان ہے
سر افرازِ تختِ سلیمان ہے

جنم لے رہے ہیں علوم و فنون
ادب آفریں ہے غزل کا جنون

رگوں میں ہے رقصاں بغاوت کا خوں
یہی خون ہے زندگی کا سکوں

جو ساقی کے تیور ہیں بدلے ہوئے
قدم میکشوں کے ہیں سنبھلے ہوئے

تمازت گلوں پہ ہے رقصاں ابھی
ہے شعلوں کی زد پر گلستاں ابھی

کسی کا بھی ساغر چھلکتا نہیں
بہک کر بھی کوئی بہکتا نہیں

ازل سے جدائی کا دستور ہے
اگرچہ ازل سے ابد دور ہے

جو حالاتِ حاضر پہ مخمور ہے
وہ باطن کے زخموں سے معمور ہے

سمجھتا رہا جس کو میں دیوتا
وہ روح و بدن کا نہ سایہ بنا

بدن کے جو زنداں میں محصور ہے
تری روح کی وہ پری حور ہے

میں قصرِ انا میں سہاگن بنی
تو لوگوں کے ہاتھوں ابھاگن بنی

جو باہوں میں آ کر وہ روٹھا نہیں
ہوس نے مری اس کو لوٹا نہیں

حسینانِ مغرب ہی جھوٹے نہیں
تمام اہلِ مشرق بھی سچّے نہیں

کبھی کوئی دل کے کلب میں ملا
کبھی چشمِ بنت عِنب میں ملا

جو لوگوں کے نزدیک گھر تھے مرے
ہمیشہ وہ مجھ سے جدا ہی رہے

زمیں پر بزرگوں کی دستار ہے
فلک تک مگر اس کی دیوار ہے

بزرگوں کے دل میں تکبّر رہا
دماغ ان کا اس فخر سے پُر رہا

بدن کا یہ سایہ بڑی چیز ہے
بھرم اس کا رکھنا کڑی چیز ہے

سراسر تکلّف ہے تیرا حجاب
سرِ بزم دل بیٹھ تو بے نقاب

محمدؐ پہ نازل ہوئی جو کتاب
نبوت کا اس میں ہے اوجِ شباب
زمانے سے اس نے کیا ہے خطاب
سوالوں کا ملتا ہے اس میں جواب
نمایاں رہے گا نبوّت کا نور
دماغوں میں جب تک رہے گا شعور

جہالت نے سیکھی ہے ان سے تمیز
غلامی تھی لوگوں کی ادنیٰ کنیز

ہر اک شخص بڑھ بڑھ کے ملنے لگا
ہر اک زخم انساں کا سلنے لگا

زمیں تو زمیں آسماں ہل گیا
جو قابیل[1] ہابیل[2] سے لڑ پڑا

ابھر آئی فطرت میں حیوانیت
نیا روپ تھا اس کا شیطانیت

زمانے میں گو جنگ جاری رہی
بدستور ہر وضعداری رہی
کئی بار بازی تمہاری رہی
کئی بار بازی ہماری رہی

۱۔ ۲۔ حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کے نام ہیں۔ توراۃ کے مطابق

کئی روپ بدلے ہیں انسان نے
ہنر اس کو بخشا یہ شیطان نے

فلک سے یہ ناگن اتر آئی ہے
بڑی دور سے اپنے گھر آئی ہے

یہ روح و بدن کو بھی ڈس جائے گی
رگ و پے میں انساں کے بس جائے گی

جو دنیا کی چکّی میں پستا رہا
تو ناسور بن بن کر رستا رہا

مری گفتگو میں بناوٹ نہیں
کہ پائے تکلم میں آہٹ نہیں

جب انسان خنجر سے کٹنے لگا
تبرّک کی مانند بٹنے لگا

جب اظہار کا ابر چھٹنے لگا
تو باطن کا شیطان بٹنے لگا

کلب شہر کے آج ویران ہیں
گلستاں نگاہوں کے سنسان ہیں

سیاست کا مرکز ہیں دارالعلوم
خزاں کی مچی ہے بہاروں میں دھوم

ہے دیر و کلیسا میں کتنا ہجوم
عبادت بھی رکھتی ہے کیا کیا رسوم

ہے انسان دھرتی پہ بے دست و پا
میسر کہاں ہے ثباتِ انا
سیاست میں جھوٹا ہے میکاولی[1]
یہ مرحب ہے صیدِ زبونِ علی
لبوں پر اگرچہ ہے نامِ علی
نہ رسمِ وفا کوئی اب تک چلی

تو ہاتھوں میں لوگوں کے بھالے نہ دیکھ
اور انساں کے سینے میں چھالے نہ دیکھ
دوپٹے سروں پر تو کالے نہ دیکھ
یتیموں کے منہ میں نوالے نہ دیکھ
مرے طاقچوں میں اجالے نہ دیکھ
سرشکوں کے آنکھوں میں جالے نہ دیکھ
زمیں پر ستاروں کے ہالے نہ دیکھ
کہ کاندھوں پہ میرے دو شالے نہ دیکھ

زمانے کی بیوہ سہاگن ہوئی
تو عصمت کی دیوی اپھاگن ہوئی
وہ لفظوں کی محفل میں مقبول ہے
جو فکر و تدبر میں مجہول ہے

1۔ نکولو میکاولی جو 3 مئی 1469ء میں فلورنس میں پیدا ہوا اور 21 جون 1527ء میں وفات پائی۔

زمانے کی ہر بات دل سوز ہے
یہی آگ روشن شب و روز ہے
جو عصمت کی چادر میں ملبوس ہے
نظر میں تمہاری وہ منحوس ہے

ادب کی یہاں اب تجارت ہوئی
طوائف کی رسوا شرافت ہوئی
قلم کا بھرم آج بیچا گیا
جہالت کا سودا خریدا گیا

مورّخ زمانے کا خاموش ہے
حقائق میں وہ مصلحت کوش ہے
جو تحریر قرطاس پر نوٹ ہے
حقیقت میں وہ جھوٹ کی پوٹ ہے

حقیقت کا کوئی پجاری نہیں
صداقت کا کوئی بھکاری نہیں
سیاست کے رہبر جو بکنے لگے
تواریخ میں آ کے خم ہو گئے

مجاور جو روحوں کے تاجر ہوئے
بدن خانقاہوں کے ظاہر ہوئے
کمینے زمانے کے شاعر ہوئے
وہ احمق بنانے میں ماہر ہوئے

جو لفظوں کے شیشوں میں ڈھلنے لگے
قبائیں وہ اپنی بدلنے لگے
کسی کو کسی پر نہیں اعتماد
دلائیں تو کس کو اخوّت کی یاد

نہ مسجد میں محمود بندہ نواز
نہ ہم دوش اس کے ہے کوئی ایاز
مجھے ہے بھلائی کی انساں سے آس
ثقافت کا بخشتا ہے اس کو لباس

ہے انسانیت کی جس انساں میں باس
قریب اس کے آئی نہیں بوئے یاس
نہ لائی کبھی دور میں اک گلاس
یہ گردش نہ آئی کبھی ہم کو راس

بنایا ہے ساقی کو اپنا امام
نہ بدلے گا اب میکدے کا نظام
یہاں پارسائی ہے بالکل حرام
مگر پارسا ہیں شرابی تمام
مساوی یہاں ہیں خواصّ و عام
کسی کا نہیں ہے کوئی اب غلام

جو بے بس سے بچے سکولوں میں ہیں
وہ کانٹوں کی مانند پھولوں میں ہیں

نہ جسموں کے بازار میں رقص ہے
نہ روحوں میں اپنی کوئی نقص ہے
یہاں سانس لینا بھی مشکل ہوا
نہ قابو میں اپنے کبھی دل ہوا
سرِ دار کوئی جو لٹکا کبھی
سلام اس کو کرنے لگی زندگی
حقوق و فرائض نہ دائم رہے
کسی بات پر ہم نہ قائم رہے
اک آنسو بھی پلکوں پہ ٹھہرا نہیں
کہ منصورؒ[1] سولی پہ لٹکا نہیں
لہو پی کے سقراطؒ[2] حیرت میں ہے
وہ ڈوبا ہوا آج غیرت میں ہے
فلاطونؒ[3] سیاست میں قیدی ہوا
بکا پھر اسیرِ غلامی ہوا
نہیں ہے غلاموں کی کوئی جگہ
کہ دنیا نہیں بے بسوں کی جگہ

1۔ حسین ابن منصور حلاج 244ھ / 857ء ایران میں ایک شہر بیضا کے قریب طور میں پیدا ہوا۔

2۔ سقراط 469 ق۔م۔ میں ایتھنز میں پیدا ہوا۔ اسے قومی دیوتاؤں کو تسلیم نہ کرنے، خدا کا اجنبی تصور پیش کرنے اور نوجوانوں کو گمراہ کرنے کے الزام میں مسکرا کر زہر کا پیالہ پینا پڑا۔

3۔ افلاطون 7-428 ق۔م میں ایتھنز میں پیدا ہوا وہ سقراط کا شاگرد تھا۔

زمینِ تمنا ہے شیشہ بدن
مگر اس کے تن پر ہے غم کا کفن

وہ کہتے ہیں ہم کو خدا مان لو
بس اتنا ہمارا کہا مان لو

لبوں پر جو آ کر دعا کھو گئی
سرِدار روح اُممؑ سو گئی

یہ شیشہ گروں کی ہے شیشہ گری
اتر آئی آنکھوں میں نیلم پری

کسانوں کی دنیا ہے غم سے بھری
اگرچہ ہے ہر ایک کھیتی ہری

کسانوں کی عظمت جو بڑھنے لگی
زمیں آسمانوں پہ چڑھنے لگی

بدن کا زمیں پر جو سایہ پڑا
تو وہ سایہ بھی آئنہ بن گیا

پشیماں پشیماں جو ہارون ہے
خزانے کی میت پہ قارون ہے

یہ ملتان گو شہرِ سلطان تھا
مگر ذہنِ بابر میں سنسان تھا

جو سازِ مساوات ہاتھوں میں تھا
تو خونِ روایات ہاتھوں میں تھا

نہ لوٹے گا انسان غاروں کی سمت
کرے گا نہ منہ چاند تاروں کی سمت
تمدّن کی دیوی جو اندھی ہوئی
تقدّس کی باہوں میں گندی ہوئی
جہاں سارتر[1] فلسفہ دان ہے
لہو کا وہاں بھی بلیدان ہے
مُعلّم جہاں بے خبر ہو گیا
جہاں کا جہاں بے نظر ہو گیا
اگرچہ وہ انسان کا معمار ہے
مگر مدتوں سے وہ بیمار ہے
وہ بیزار ہے اب نئی نسل سے
یہاں بات بنتی ہے اب اصل سے
سروں پر کتابوں کے انبار ہیں
یہ لوگ اپنی ہیئت میں اخبار ہیں
جو اقدارِ نو کے طرفدار ہیں
تعصّب میں اپنے گرفتار ہیں
انہیں مدرّسوں سے محبّت نہیں
اور اطفال پر کوئی شفقت نہیں

1۔ ژاں پال سارتر جو پیرس کا باشندہ تھا اور وہیں اس نے 1905ء میں جنم لیا وہ کیرکیگارڈ کی طرح وجودی ہے۔

جو لفظوں پہ لوگوں کی تکرار ہے
تو اصلِ حقیقت سے انکار ہے
جو شہرِ تکلّم میں عیّار ہے
وہی آج دنیا میں فنکار ہے
مباحث پہ لوگوں کو اصرار ہے
نہ اپنی جہالت کا اقرار ہے

فضا کی فضا ہی مکدّر ہے آج
نظر میں نہ قدِّ سکندر ہے آج

یہ مزدور اپنا کھلونا نہیں
مقدر میں اب اس کے رونا نہیں

فضائے غلامی بدل ہی گئی
یہاں رسمِ آقائی چل ہی گئی

یہ دیوارِ نفرت جو گر جائے گی
ہوائے کدورت بھی پھر جائے گی

جب انساں کی صورت سنور جائے گی
خودی لوٹ کر اپنے گھر جائے گی
جو وحشت دماغوں میں بھر جائے گی
بہار و خزاں سے گزر جائے گی

جو آیا تب چل کر عمل کے قریب
نہیں علم و حکمت میں وہ اب غریب

وہ اپنی شرافت کے ٹھہرے حریف
نکل آئے گھر سے جو باہر شریف

وہ عورت زمانے میں مظلوم ہے
جو پا کر پجاری کو مغموم ہے
حقیقت تمام اس کو معلوم ہے
مگر اپنی فطرت میں معصوم ہے

مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں
وہ عورت جو حرف و حکایت نہیں

سرِ دار آ کر بھی چوما تمہیں
نگاہوں کے خنجر پہ دیکھا تمہیں

اداؤں کے بھی خوب انداز ہیں
نگاہیں تمہاری بھی غمّاز ہیں

وہ ماضی کی باتیں بھلا دیجیے
مری لغزشِ پا بتا دیجیے

خدائی تمہاری بھی تسلیم ہے
ہماری محبّت ہی اقلیم ہے

تری بے رخی کی شکایت نہیں
کہ یہ بے رخی وجہِ نفرت نہیں

جو کی اختیار ان سے بیگانگی
وہ تھی اصل میں میری دیوانگی

ہوئے ہیں گناہوں سے ہم شرمسار
اٹھایا نہ ہم نے کبھی ان کا بار
گناہوں میں پایا وہ سوز و گداز
ہُوا جس سے افشا خدائی کا راز

جو مغرب کی دنیا میں خدمات ہیں
شہادت میں ان کی کچھ آیات ہیں
وہ جذبات کے ترجماں بن گئے
زمیں بن گئے آسماں بن گئے

وہ علم و ادب کی انا بن گئے
جو قول و عمل کے خدا بن گئے
اگرچہ تجارت بھی ملحوظ ہے
سیاست مگر ان کی محفوظ ہے

جو حکمت کے گھر گھر جلائے چراغ
تو دانش کے پھولوں سے مہکائے باغ
جو انسان انساں سے کاٹا گیا
اسے اصل ایماں سے کاٹا گیا

تمہیں آج مجھ سے جو نفرت ہوئی
تو دل سے گریزاں محبّت ہوئی
بنام خدا لوگ کٹتے رہے
تبرکّ کی مانند بٹتے رہے

سروں سے جو مقتل سجایا گیا
تو قاتل کو اس میں بسایا گیا

نصاریٰ کلیسا میں ٹھہرے نہیں
اور ان پر مسیحا کے پہرے نہیں

جو بن کر مجھے آج راہب ملا
کلیسا کا گویا مصاحب ملا

جو جسموں کے اندر تھی روحِ نہاں
رہیں ان سے اپنی شناسائیاں

ہر امید ہے یوں بہاروں میں یاس
بڑھی جا رہی ہے گلستاں میں پیاس
اتارو تم اپنے بدن کا لباس
کہ ہے روح اب اس کے اندر اداس

ملاقات حالی[1] سے اپنی ہوئی
تو کچھ دیر تک گرم محفل رہی

ادب کی زباں میں جو آزاد[2] تھا
وہ روحِ ادب کا بھی ہمزاد تھا

1۔ مولانا الطاف حسین حالی جو 1837ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔

2۔ مولانا محمد حسین آزاد جو دہلی میں 1830ء میں پیدا ہوئے۔

جو سیدؒ نے بخشا نیا ولولہ
جہالت کی دھرتی پہ تھا زلزلہ

مزاروں پہ اکثر میں جاتا رہا
اور اشکوں سے دیپک جلاتا رہا

ہمیں معبدوں میں جواری ملے
تو گنگا کے میلے میں ناری ملے
جو پنگھٹ پہ دل کے شکار ملے
تو جمنا کے در پر بھکاری ملے

جنہیں کہہ رہا ہوں میں صحرا نشیں
وہ ٹھہرے ہیں قلب و نظر کے امیں

جہالت کے خیمے لگانے لگے
تعصّب کے جلوے دکھانے لگے

جب اہلِ حرم کو بلایا گیا
تو سُولی پہ ان کو چڑھایا گیا

جو سُولی پہ خود کو چڑھاتے ہیں لوگ
تو حالات کا منہ چڑاتے ہیں لوگ

سرِ راہ بن کر وہ عبرت ملی
برہنہ جو آدم کو فطرت ملی

۱۔ سرسید احمد خاں 1817ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔

زمانے نے ان کو کیا سنگ سار
جو شیشوں میں رہتے تھے بن کر بہار
بہاروں کا اب تک نہ اترا خمار
چمن ہو گیا گو خزاں پر نثار

جلا چاندنی میں گلوں کا شباب
نہ راس آئی ہم کو چمن کی شراب
خدائی بنی ہے خدا کا عذاب
قریب آ گیا جیسے یوم الحساب

کمینے ہی دنیا میں برتر رہے
شریف آدمی حرفِ احقر رہے

یگانوں میں یوں اجنبی ہو گئے
اجالوں میں ہم تیرگی ہو گئے
نگاہوں کی جو روشنی ہو گئے
وہ سامانِ دلبستگی ہو گئے

دہانے جو زخموں کے سلنے لگے
گل و خار آپس میں ملنے لگے

زمیں پر جو انساں دل آویز تھے
فلک کی نگاہوں میں چنگیز تھے
جو حکّامِ بھارت میں انگریز تھے
وہ فکر و نظر میں بلا خیز تھے

جو اپنے وطن کا پُجاری نہیں
کوئی حال بھی اس پہ طاری نہیں
مسلماں سے ان کو عداوت رہی
تو ہندو سے رسمِ محُبتّ رہی
مذاہب پہ چشمِ حقارت رہی
سیاست میں ان کی تجارت رہی
حسینانِ مغرب پہ شیدا ہوئے
مگر بطنِ مشرق سے پیدا ہوئے
ہیں روح و بدن میں بڑے فاصلے
کہ جنتّ میں آ کر لُٹے قافلے
خداؤں کے جھوٹے سہارے گئے
بتوں کے پجاری تھے مارے گئے
کوئی اشک آنکھوں میں ڈھالا نہیں
کوئی جام ہم نے اچھالا نہیں
خودی آج لفظوں کا دھندہ بنی
وہ چوَبِ کلیمی کا رندہ بنی
خطابت میں زورِ خطابت بھی ہے
عمل سے گریزاں طبیعت بھی ہے
یہ اپنے قلم کا اک اعجاز ہے
ممولا بھی لفظوں کا شہباز ہے

لہو سے یہاں کوئی کھیلا نہیں
کہ یہ مقتلِ جاں ہے میلہ نہیں

محبت نہیں ہے بدن میں اسیر
یہ کھینچی ہے پتھر پہ ہم نے لکیر

لبوں پر ترے گو حلاوت سی ہے
مگر دل میں اب تک کدورت سی ہے

خودی و خدا سے بغاوت سہی
ہمیں اپنے خوں سے عداوت سہی

جو ساغر میں کرنوں کی مے پی گئے
وہ میخوار بن عشق و مستی گئے

یہ رازِ انا بھی عجب راز ہے
خدا سا خدائی میں انداز ہے
کوئی نالہ کب نغمۂ ساز ہے
ہر آواز گنبد کی آواز ہے

یہ کیسی بغاوت کی تمہید ہے
کہ باطن پہ لوگوں کی تنقید ہے

نہ کثرت میں تجرید آئی کبھی
نہ تشکیک، اشراق لائی کبھی

غریبوں کی دنیا میں اب عید ہے
کہ شاداب ہر نخلِ امید ہے

گلُوں کی روش پہ مچلنے لگا
میَں خاروں کی راہوں پہ چلنے لگا
جو خواہش کا لاوا ابلنے لگا
تو شبنم کی آتش میں جلنے لگا

بدن کے وہ مندر میں ایسے مِلا
کنول چاندنی کے لہو میں کھِلا

لبوں پر لہو جس کے نمکین ہے
مسرّت پہ اپنی وہ غمگین ہے
اگرچہ طبیعت میں سنگین ہے
مگر گفتگو اس کی رنگین ہے

جو چکرّ میں انساں کی قسمت رہی
نہ انساں کی انساں سے نسبت رہی

سروں پر اجل کی ہے چادر پڑی
لبِ گور ہے زیست عریاں کھڑی

جو وحشت کا رستہ کیا اختیار
تو دانش کا دامن ہوا تار تار

سرِ دار مجھ کو جنوں لے گیا
فسانے کے در پر فسوں لے گیا

یہ انساں حقیقت میں کمزور ہے
یہ یزداں کے ایوان میں شور ہے

خود آگاہ انسان انسان ہے
دگرنہ ندامت کا سامان ہے

تو کہہ ڈال جو آئے ایمان میں
نہ فرق آئے گا کچھ تری آن میں

خدائی تری اس کو منظور ہے
جو انسان فطرت میں مجبور ہے

بدن کا جہاں گرچہ سنگین ہے
مگر پیرہن اس کا رنگین ہے

محبت نے روکا ہے رک جایئے
سر افراز ہونے کو جھک جایئے

جو وحشت کی صورت بدل جائے گی
تو مٹّی کی مُورت بدل جائے گی

بشر نفس پر اپنے قادر نہیں
یہ رازِ خفی کس پہ ظاہر نہیں

زمیں ہے زمیں آسماں آسماں
مکانِ بشر ہے مگر ہر مکاں

جو سازِ رگ جاں کو بخشی زباں
تو ہونے لگے اس میں نغمے رواں

قیامت جو سر سے گزر جائے گی
گزر کر نہ جانے کدھر جائے گی

لہو سے جو دامن کو بھر جائے گی
تو چشمِ وفا کام کر جائے گی
جو دریائے دل میں اتر جائے گی
تو اشکوں سے میرے نکھر جائے گی

یہ ظاہر میں جلوے ہیں باطن کے دیکھ
کہ تیور بھی بدلے ہیں ضامن کے دیکھ

ازل سے عناصر میں پیکار ہے
ملے دل کو تسکین دشوار ہے
جو روزِ ازل سے خطا کار ہے
وہ بخشش کے رستے میں دیوار ہے

اندھیرے میں کیا وہ بنے گا چراغ
لہو پی کے بگڑا ہے جس کا دماغ

روایت کے سکّے بھی کھوٹے ہوئے
قد آور جو تھے آج چھوٹے ہوئے

رواں عزم کا جب سفینہ ہوا
تو دریا کا دریا مدینہ ہوا

تباہی کا باعث حکومت بنی
سیاست کی چاہت خصومت بنی
لہو چوسنا اک روایت بنی
یہ انساں کی رنگیں ثقافت بنی

ہماری جو صدیوں کی تہذیب ہے
وہ اس دور میں وجہِ تخریب ہے

جو ہاتھوں میں پتھر، نگینہ ہوا
تو جامِ نظر آبگینہ ہوا

اگر آگہی ذہنِ جاہل میں ہے
تو قانون بھی دستِ قاتل میں ہے

جو طوفانِ غم موج در موج ہے
وہ خوں خوار موجوں کی اک فوج ہے

جو لوگ اکثریت سے حیواں ملے
اچانک کبھی ان میں انساں ملے
غزل کے جو ہم کو نگہباں ملے
ادب میں دماغ ان کے ویراں ملے

جو زخمِ بہاراں غزل خواں ملے
تو صحرا میں ہم کو گلستاں ملے
جو دنیا میں محشر بداماں ملے
وہ معبد کے در پر بھی نالاں ملے

کیا جس نے جینے کا اب اہتمام
مروّت کے لب پر رہے گا وہ نام

خدا کی جہاں میں یہ تنظیم ہے
ارادے کے تابع یہ اقلیم ہے

جو انساں کی دنیا میں تکریم ہے
حقائق میں در اصل ترمیم ہے

پرندوں کی صورت جو اُڑنے لگا
کہاں موڑنے سے وہ مُڑنے لگا
جو قبضہ فضاؤں پہ کرنے لگا
ہواؤں کو دامن سے بھرنے لگا

مگر پھر بھی چلنا نہ آیا اسے
ستاروں میں ڈھلنا نہ آیا اسے

خدا کی ازل سے ہے تجھ پر نظر
اگرچہ ہے طولانی تیرا سفر

گر انسان کچھ کام کر جائے گا
تو خوابِ مشیّت سنور جائے گا

کلب میں ملی زندگی کو زباں
بنی اپنے حالات کی ترجماں

برہنہ نظر میں جو وجدان تھا
اسی میں قیامت کا امکان تھا

بڑائی تمہاری بھی اب مان لی
خدائی تمہاری بھی اب جان لی

نگاہوں میں رقصاں ہے دل کا سکوت
ہر آنسو سے ملتا ہے اس کا ثبوت

جو انساں کی میّت پہ خاموش ہے
لہو پی کے اس کا وہ مدہوش ہے

جہاں قریہ نبی آئے ہیں
وہاں بعد ان کے ولی آئے ہیں

انہوں نے دلوں کو منوّر کیا
غلاموں کو آ کر سکندر کیا

رضا پر جو لوگوں کی راضی نہیں
کسی شہر کا وہ بھی قاضی نہیں
ہر اک شخص دنیا میں پاجی نہیں
ہر اک شخص دنیا میں حاجی نہیں

مذاہب میں ایسی ولایت نہیں
جہاں پر ہماری قیادت نہیں
صحیفوں کی چھاؤں میں راحت نہیں
اگرچہ دلوں میں تمازت نہیں

کسی سے مجھے کچھ شکایت نہیں
یہ کہہ کر مکرنے کی عادت نہیں
گُلوں کی گُلوں سے رقابت نہیں
کہ گلچیں سے اُن کو شکایت نہیں

کسی سے انہیں گرچہ نفرت نہیں
مگر پھر بھی دل میں مُحبّت نہیں

وہ لوح و قلم کی عبارت نہیں
کہ جس میں لہو کی حرارت نہیں

مسلماں ہیں جب سے جسارت نہیں
میسر کہیں بھی صدارت نہیں
عمل میں کوئی اب شرافت نہیں
زباں میں کسی کی حلاوت نہیں

یہ جمنا و راوی جو ویران ہیں
فرات اور دجلہ بھی حیران ہیں
بغاوت کے سینوں میں ارمان ہیں
سمندر کے ساحل پہ طوفان ہیں

جو راون[1] کو جنگل میں سیتا[2] ملی
تو ارجن[3] کو اس کی کویتا ملی

جو مندر میں خوں سے دوالی ہوئی
تو رادھا ہماری سوالی ہوئی

دسہرے میں مجھ کو شیاما ملی
کنول کی طرح وہ کلی بھی کھلی

1۔ لنکا کا راجہ راون جو سیتا جی کو نکال کر لے گیا تھا۔

2۔ سیتا خاندان کوشل سے تعلق رکھتی تھی۔

3۔ پانڈو کا بیٹا ارجن۔

وہ رامائن[20] ایسے سناتی رہی
نگاہوں کے جادو جگاتی رہی
وہ روح و بدن میں سماتی رہی
صحیفے دلوں کے جلاتی رہی

ملا ہم کو کھیتوں میں جو بھی کسان
نظر آیا ہر فصل میں وہ جوان
کہاں کی محبت کہاں کا گیان
ہے وجدان دنیا میں اب بے زبان

بنے کیا کسی کا بھلا وہ رفیق
ہو دل جس کا دریا کی صورت عمیق

یہاں فلسفہ کام آتا نہیں
کوئی فلسفی راہ پاتا نہیں

ہر اک شخص دنیا میں مزدور ہے
ضرورت کے ہاتھوں سے مجبور ہے

ہر اک گھر میں اک انقلاب آ گیا
کہ گردش میں جامِ شراب آ گیا

حساب اپنا سب کو چکانا پڑا
کہ مقتل میں خود چل کے آنا پڑا

20۔ رامائن ہندوؤں کی مقدس کتاب ہے۔

محل اپنے ہاتھوں سے ڈھانا پڑا
غریبوں کو اپنا بنانا پڑا

یہاں خوں بہانے کا دستور ہے
یہ دستور لوگوں کا منشور ہے
ستم گر کی ہر بات منظور ہے
ستم سہہ کے ہر شخص مسرور ہے

جو عابد ہے معبد میں مغرور ہے
اگرچہ نظر اس کی بے نور ہے

مجھے دیکھتے ہیں انیس و دبیر
سخن جن کا پتھرّ کی ٹھہرا لکیر

کہاں میں ہمارے وہ روشن ضمیر
کہ ملتی نہ تھی جن کی پہلے نظیر
جو باقی ہیں اب کچھ رئیسِ کبیر
وہ لگتے ہیں ہر بات میں بے ضمیر

جو ملتے ہیں تکیوں پہ اب بھی فقیر
وہ اوباش لوگوں کے ٹھہرے ہیں میر
غرور و تکبر کے ہیں جو اسیر
وہ کہتے ہیں خود کو زمانے کا پیر

ہیں گو کشمکش میں یہ دیر و حرم
مگر پھر بھی باقی ہے ان کا بھرم

نہ کرنا کسی پر نگاہِ کرم
دھرم آپ کا ہو گا یوں محترم
کریں گے نہ جانے وہ کیا کیا رقم
کہ تھاما ہے اب جاہلوں نے قلم

بغاوت کا لوگوں میں امکان ہے
عدالت میں قاضی پریشان ہے

حقائق کی مے سے جو مدہوش ہیں
وہ ہر ایک محفل میں خاموش ہیں

عدالت وکالت میں شامل ہوئی
تو بارِ امانت کی حاصل ہوئی
جہالت سرِ دار عائل ہوئی
فراست کسی کی نہ کامل ہوئی

وہ قاضی جو قاتل پہ مائل ہوا
سرِ عدلیہ خود بھی قاتل ہوا

جو علم اور دانش کے مخزن ہوئے
وہ اپنی تمنّا کے مدفن ہوئے

نگاہوں میں جن کی ہیں باریکیاں
دلوں میں وہ رکھتے ہیں تاریکیاں

جو نانِ شبینہ سے محروم تھے
انہیں اپنے مقسوم معلوم تھے

جو مقتل میں مقتول معصوم تھے
وہی اپنی میّت پہ مغموم تھے

نہیں کوئی دنیا میں دانائے راز
جسے اب کہا جائے تاریخ ساز

یہ بھارت کی سرحد پہ جو فوج ہے
سمندر کی بپھری ہوئی موج ہے

عجب اس جہاں میں تری سوچ ہے
کہ اس سوچ میں کس قدر لوچ ہے

عدالت ہوئی جا رہی ہے فریق
کہاں سے ملیں گے تمہیں اب رفیق
خدا کی ہر اک بات ہے گو دقیق
رہا ہے ہمیشہ وہ سب کا شفیق

جو علم و ادب کا سمندر ہیں وہ
تو کوہِ جہالت کے پتّھر ہیں وہ

کسی در پہ جس نے جھکایا ہے سر
لقب اس نے دنیا میں پایا ہے سر

کبھی اپنا دامن بچایا نہیں
گناہوں سے پیچھا چھڑایا نہیں

خطائیں مری ہیں مجھے یوں عزیز
کہ ہے ہر خطا میرے گھر کی کنیز

میں کہتا رہا شعر بے ساختہ
اڑاتا رہا ذوق کی فاختہ

وہ نٹشے[1] جہاں میں فسانہ بنا
جو فوق البشر کا نشانہ بنا

جہاں ذہن انساں میں رحمان ہے
وہاں برگساں[2] بھی پریشان ہے

ہیں ماضی میں گُم جن کے فکر و خیال
کہاں ہے عیاں حال کا ان پہ حال

جو لفظوں کا جادو جگانے گئے
خطابت کے دریا بہانے گئے

سکولوں نے بخشی ہیں عیاریاں
گلستاں میں ہیں اب شرر باریاں

یہ کالج رقابت کے مرکز بنے
سراسر عداوت کے مرکز بنے

مُسلّط جو اِفلاس ذہنوں پہ ہے
نظر اس کی ہاتھوں کے کنگنوں پہ ہے

تمدن کی دیوی ہے اب بے لباس
کہ مندر میں پھیلا ہے خوف و ہراس

1۔ نٹشے 1900ء - 1844ء

2۔ ہنری برگساں 18 اکتوبر 1859ء میں پیرس میں پیدا ہوا۔ وفات 4 جنوری 1941ء میں ہوئی۔

جسے کھا گئی ہے تمہاری نظر
کہاں ہے زمیں پر ہمارا وہ گھر
چھلکتا ہے لوگوں کی آنکھوں میں شر
کہ ہے ہر نظر پر ہماری نظر

چمن میں ہے شبنم ہر اک شاخ پر
نہیں شعلہ گل سے پھر بھی حَذر
ہے درپیش آدم کو لمبا سفر
ہے درکار منزل کو خونِ جگر

مُکرّم مُعظّم جو استاد ہیں
لبوں پر مجُسّم وہ فریاد ہیں
خطیبوں کی پھیکی سی تلقین ہے
اگرچہ ہر اک بات نمکین ہے

کہانی جو آدم کی رنگین ہے
وہی اس کے سینے پہ سنگین ہے
دیارِ نظر میں جو اقبال[1] ہے
وہ حکمت کے کندھے پہ اک شال ہے
سیاست کے شیشے میں جو بال ہے
فرنگی کی یہ بھی کوئی چال ہے

1۔ علامہ محمد اقبال، 9 نومبر 1877ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے اور 1938ء میں وفات پائی۔

جہاں فلسفہ علم کی روح ہے
وہاں فکر سقراط مجروح ہے

"مفکر" کھنڈروں سے نکلتے نہیں
فراست کے چشمے ابلتے نہیں
بدن جو حرارت سے جلتے نہیں
پگھل کر بھی گویا پگھلتے نہیں

کوئی آنکھ جو چشمۂ اشک ہے
وہ آنکھ اصل میں قابل رشک ہے

مری خواہشیں ہیں جو اب تک جواں
لہو بھی ہے میری رگوں میں رواں
جہاں کی حقیقت ہے مجھ پر عیاں
کہ میری نظر میں ہے سارا جہاں

یہ بازی غزل کی بھی تم جیت لو
مگر اپنے ہاتھوں میں سنگیت لو

غزل سے غزل کو ملاتے رہو
یہ سازِ ازل تم بجاتے رہو
سرِ دار وعدہ نبھاتے رہو
یہ رسمِ وفا تم چلاتے رہو
صنم پتھروں سے بناتے رہو
انہی سے گھر اپنا سجاتے رہو

یہ جادو بدن کا جو چل جائے گا
جنوں علم و عرفاں میں ڈھل جائے گا
جو تیور فلک کے بدل جائیں گے
نشیمن گلستاں میں جل جائیں گے

جو توحیدِ باری پہ شاہد ہوئی
وہ کثرت بھی لمحوں میں واحد ہوئی
تمنّا جو یوسف کی عابد ہوئی
نظر کی زلیخا بھی زاہد ہوئی

جو تم نے کِیا ہے ادب میں مذاق
بتاؤ تم اس کا سیاق و سباق

خدا کی غریبوں پہ رحمت ہوئی
یہ رحمت ہی مال اور دولت ہوئی

جو واعظ کے دل میں کدورت نہیں
تو کیوں اس کی پھر قدر و قیمت نہیں

بزرگوں میں اکثر تکبّر ملا
کسی میں نہ کوئی تدبّر ملا
زمانے کا ہم کو تفکّر ملا
عبادت کے در پر تشکّر ملا

ہر اک شخص کو مصلحت ہے عزیز
نہیں آج ورنہ کوئی شے عزیز

مقدّر کے مارے بھی سو جائیں گے
وہ خوابوں کے صحرا میں کھو جائیں گے

ہوئی جب سرِ حشر رحمت کی بات
تو وہ بات ٹھہری قیامت کی بات

ذریعہ ہے تمثیل مقصد نہیں
حقیقت ہے اس کا کوئی رد نہیں

عجب فکرِ سعدیؔ[1] کا انداز ہے
کہ ہر شعر اک قُلزمِ راز ہے

وہ شعر اور حکمت میں فیّاض تھے
تو نبضِ زمانہ کے نبّاض تھے

انہی سے ملا زندگی کا سراغ
کہ رکھتے تھے وہ آگہی کا دماغ

زباں میں ہماری جو اب علم ہے
نفس کی برہنہ وہ اک فلم ہے

لگے وہ پُر اسرار چہرے ہمیں
ملے جو سرِ دار پہرے ہمیں

جو تحریر میں ایک تمثیل تھی
وہ افکار رومیؒ[2] کی قندیل تھی

1۔ ایران کا عظیم شاعر مصلح الدین سعدی ولادت 610 ہجری اور 615 ہجری کے درمیان۔ وفات 691 ہجری۔

2۔ محمد نام، جلال الدین لقب 604ھ میں بمقام بلخ پیدا ہوئے، 672ھ میں قونیہ میں وفات پائی۔

مجھے لغزشوں سے مُبرّا نہ کر
کسی ذات پر تو تبرّا نہ کر
نظر میں ہوں میں شہرِ ملتان کی
یہ منزل ہے اب میرے عرفان کی

غزل کی رگوں میں لہو سرد ہے
تو چہرہ غزل گووں کا زرد ہے
ہے سنگیت ہاتھوں میں احسان کا
لبوں پر بھی نغمہ ہے انفاس کا
نہیں ہے بھروسہ کوئی آس کا
ہوا سے ہے ناطہ جو بُوباس کا

تغزّل کی ناگن جو رقصاں ہوئی
وہ اک موج سے بڑھ کے طوفاں ہوئی
غزل جو گناہوں کا امکاں ہوئی
خودی و خدا کا وہ عُنواں ہوئی

زباں پر جو پہرے بٹھائے گئے
تو خوابیدہ فتنے جگائے گئے
جو اُلفت کے خیمے جلائے گئے
چراغِ وفا بھی بجھائے گئے

بھرم کو کئی بار رُسوا کیا
شب و روز پھر اس کا چرچا کیا

خدا و صنم حرفِ الزام ہیں
کہ دیر و حرم آج نیلام ہیں
یہ واعظ خطیبانِ خوش نام ہیں
مگر شہر کا ایک دام ہیں

زمانے میں جو ننگِ اقوام ہیں
وہ اپنے گھروں میں بھی بدنام ہیں
نہ رندوں کے ہاتھوں میں اب جام ہیں
نہ جلوے غزل کے لبِ بام ہیں

مسائل تصوّف کے باریک ہیں
تو وجدان کے گوشے تاریک ہیں

خُدا کا جہاں بھی ہوا راز فاش
نظر آئی صوفی کے مسلک کی لاش

مسیحا بھی سانسوں کا محتاج ہے
صلیبوں کا گو اس کے سر تاج ہے

نئے بت تراشے گئے ہیں یہاں
کچھ آزر بھی دیکھے گئے ہیں یہاں

جو غاصب مراسم بڑھانے لگے
وہ نقشِ کہن سب مٹانے لگے
جو یادوں کے کتبے لگانے لگے
اناؤں کے پتھّر ہٹانے لگے

کئی نام سڑکوں کے بدلے گئے
تو خواہش کے مندر میں چکلے گئے
تقاضہ ہے خود کو بھی عریاں کروں
کہ زخموں کو اپنے گلستاں کروں

کئی آدمی سے جو انساں ہوئے
وہ انسانیت سے گریزاں ہوئے
جو دامن نظر کا ہوا تار تار
وہ تارِ نظر سے سِیا بار بار

نہ پیدا کوئی دل میں نالہ ہوا
نہ رقصاں کوئی لب پہ نغمہ ہوا
سوئمبر میں دل کے نہ سنجوگ ہے
زمیں پر بدن کا فقط بھوگ ہے

اگرچہ زمانہ ہے قانون ساز
جرائم سے آتا نہیں کوئی باز
کتابوں میں محفوظ اخلاق ہے
عمل پر کہاں اس کا اطلاق ہے

کہیں اس کا ماتم نہ اب سوگ ہے
یہ عصمت دری جی کا اک روگ ہے
عمارت تمہاری فلک بوس ہے
مری جھونپڑی پر فقط اوس ہے

جو منظر بھی دیکھو وہ دل سوز ہے
یہی ابتلا اب شب و روز ہے

پرانی یہ صدیوں کی تہذیب ہے
نئی ہر زمانے کی ترتیب ہے

تقدس بد اماں تھا یہ ایشیا
مگر بن گیا آج اک ویشیا

دلیل آسماں اس کی دن رات ہیں
کہ مسخ شدہ اپنی آیات ہیں

ملا جو ہمیں اپنی ہستی میں سوز
کہاں وہ تخیّل پرستی میں سوز

جو ذہنوں میں رکھتے ہیں ہم کَبیر
وہ قرطاس پر ہیں فقط اک لکیر

اب اقدارِ نو کا جو معیار ہے
وہ راہِ تدبّر میں دیوار ہے

یہ کیا فکر، فن میں تو بیکار ہے
وہ بے معنی لفظوں کی جھنکار ہے

جو غزلوں کا دھرتی پہ بازار ہے
اسے احتیاجِ خریدار ہے

پجاری جو فن کا سردار ہے
وہ دانش کے کندھوں پہ اک بار ہے

سوادِ نظر جن کی اوقات ہے
اجالا بھی دن کا انہیں رات ہے
اگرچہ زر و مال میں مست ہیں
مگر لوگ پھر بھی تہی دست ہیں

جو سایہ رہے بن کے دیوار کا
وہ دیکھے گا کیا حسن بازار کا
نمونہ نہیں کوئی کردار کا
کہ سکّہ چلا صرف مکّار کا
بھروسہ نہیں اب کسی یار کا
کہ ہر یار چہرہ ہے عیّار کا
برہنہ ہے محفل میں اب شاعری
کہ رقصاں ہے آنگن میں فن کی پری

بدن کا ہے شیشۂ مرے ہاتھ میں
اور اک شیشہ روح بھی ساتھ میں
لبِ بام کوئی تماشہ نہیں
کہ رقصاں کسی کو بھی دیکھا نہیں

اداسی سر شام رقصاں ہوئی
وہ شب کی خموشی کا عنواں ہوئی
یہ رقصِ غزل کی جو تقریب ہے
روایات کی اس میں تہذیب ہے

جہاں بھی ہو جمہوریت کا نظام
وہاں کوئی ہوتا نہیں ہے غلام

غلامی بنام غلامی نہیں
سلامی برائے سلامی نہیں

میسّر ہے سب کو یہاں ملکیت
کہ اپنا ہے سارا جہاں ملکیت

ملیں جب سے دنیا کو آزادیاں
بہم خود کیں یاروں نے یہ دردِ جاں

ادیب اپنی عظمت بتانے لگے
فنونِ لطیفہ ٹھکانے لگے

زمانے میں یورپ کی یوں دھوم ہے
کہ علم و ہنر کا وہ اک روم ہے

تاثرّ فرائڈؔ[1] کا ہے یوں کثیف
دل اس کا تھا مرعوب جنس لطیف

غنیمت ہے دنیا میں زن کا وجود
اسی سے ہے یاں حسنِ ظن کا وجود

جہاں فن کا سورج نہیں ڈوبتا
وہاں کام کیا فکر کی رات کا

۱۔ سگمنڈ فرائڈ، غیر معمولی نفسیات کا بانی، فرائڈ کا عقیدہ ہے کہ [illegible] جنس (۱۹۲۱) [illegible] ہوتے ہیں

زمانے میں قومیں جو مصروف ہیں
وہ علم و ہنر میں بھی معروف ہیں
حقائق پہ رہتی ہے ان کی نظر
وہ منزل کی جانب ہیں گرمِ سفر

جو منزل کی جانب روانہ ہوئے
وہ طوفاں سے شانہ بشانہ ہوئے
کئی لوگ ہم میں مجاہد ہوئے
زمیں آسماں اس کے شاہد ہوئے
گنہگار اپنے جو زاہد ہوئے
وہ تاریخ میں اپنی قائد ہوئے

قیادت ہے حق جن کا اقوام میں
وہ رکھتے ہیں اپنا لہو جام میں
مُحرّم ہیں جو لوگ کرتے ہیں عید
بڑا خوش ہے ان کے عمل پر یزید
ہوئی آج خلوت میں عصمت شہید
نہیں ظلم کی اب ضرورت مزید

ہر اِک ذہن ہے گرچہ دارالکتاب
سوالوں کے لیکن ہیں منفی جواب
یہ روزِ اَزل سے ہیں بیماریاں
سجی ہیں زبانوں سے الماریاں

کفن ہے جو لفظوں کا سر پر ترے
تو سایہ ہے کاغذ کا گھر پر ترے

یہ اہل قلم کے جو شہکار ہیں
تہی جیب ان کے خریدار ہیں
جو خاموش ارباب افکار ہیں
وہ اپنے ضمیروں کا اظہار ہیں

کتابوں کے انبار بھی ہیں عجیب
بناتے ہیں جو اہلِ زر کو غریب
قلم کی کہیں بھی حکومت نہ تھی
کہ طاقت کو اس کی ضرورت نہ تھی

قلمکار کب ایسے پیدا ہوئے
جو مرہون اہلِ کرم کے نہ تھے
رہے ہیں نظر میں تمہاری ملوک
جو سازش سے کرتے رہے ہر سلوک

جو انساں کا انساں ذریعہ رہا
سرِ آسماں اس کا رُتبہ رہا
جو انساں کی دنیا میں تدبیر ہے
وہ لوحِ ازل پر ہی تحریر ہے

دیا خود کو اہلِ قلم نے فریب
اگرچہ نہ دیتی تھی یہ بات زیب

وہ برنارڈ شاہ[1] اک فرنگی ادیب
تھے محبوب جس کو خدا کے حبیب
پسند اس کو تھی ہر ادائے رسولؐ
نظر میں وہ رکھتا تھا حُسنِ قبول

پیالی جو ہونٹوں پہ رقصاں رہی
زباں پر مُحبّت کا عنواں رہی
یہ میزوں پہ اپنی جو انسان ہیں
ثقافت کی دنیا میں حیوان ہیں

بنے سارتر کے پجاری جو لوگ
ہیں دین اور مذہب سے عاری وہ لوگ
کہی کتنی اچھی یہ ہیگل[2] نے بات
ہے انساں کا دل ملکِ اخلاقیات

مگر کانٹ[3] کی فکر کچھ اور ہے
اسے عقل ہی محورِ غور ہے
کلیسا پہ لوتھر[4] کا احسان ہے
وہ روحِ مسیحا پہ قربان ہے

1۔ مشہور ڈرامہ نگار برنارڈ شا۔

2۔ جارج ولہلم فریڈرک ہیگل 27 اگست 1775ء کو سٹٹگارٹ میں پیدا ہوا 14 نومبر 1831 کو برلن میں وفات پائی۔

3۔ ایمانوئل کانٹ (1724-1804) "تنقید عقل محض"، "تنقید عقل عملی" اور "تنقید تصدیق" اس کی تین شہرہ آفاق تصانیف ہیں۔

4۔ مارٹن لوتھر (1483-1546) مصلح کی حیثیت سے مشہور ہے۔

ہے رقصاں جو دستِ اجل میں حیات
اسی سے مکمّل ہے یہ کائنات
کمینوں کے ہاتھوں میں سنگیت ہے
کہ دنیا میں اب مات ہی جیت ہے

طوائف جو روحِ ثقافت رہی
تو زاہد کو اس سے عداوت رہی
بدن کے کلیسا میں مریم رہی
وہ بن کر نگاہوں میں شبنم رہی

اکڑ کر نہ چلیے زمیں پر کبھی
شکن ڈالیے مت جبیں پر کبھی
کئی بار پامال سلطاں ہوئے
کئی بار گلزار ویراں ہوئے

یہ تخلیقِ فن درد ہے کرب ہے
کہ سازِ غزل کے لئے ضرب ہے
بدن کی زمیں پر ثواب و عذاب
نظر آ رہا ہے خدا کا عتاب

نظر میں نہیں کوئی آشوبِ درد
ہے چہروں پہ لوگوں کے باطن کی گرد
ضمیروں کے منبر پہ تقریر ہے
یہ بوسیدہ کاغذ پہ تحریر ہے

بدن کے جو صحرا سے نکلے نہیں
وہ اپنی حرارت سے پگھلے نہیں
چمن میں ہیں رقصاں بہاروں کے ناگ
جھلس دے گلوں کو نہ شبنم کی آگ

زمیں شعر کی یوں مُقدّس ہوئی
کہ نوک قلم پر مُسدّس ہوئی
وجودِ صنم سے جو واقف نہیں
خدا کی نظر میں وہ عارف نہیں

خدا کو فقط عاجزی ہے عزیز
سراپا نیاز آدمی ہے عزیز
سروں پر ہمارے جو اولے نہیں
ابھی بادباں ہم نے کھولے نہیں

گھروں میں بلا کی ہیں تاریکیاں
دلوں میں خلا کی ہیں تاریکیاں
نظر کے جو سائے بھیانک ہوئے
کئی حادثے پھر اچانک ہوئے

کسی شخص سے میں جو آگے بڑھا
تو بڑھ کر نہ پھر اس سے پیچھے ہٹا
جو سائے کی مانند ڈھلتا رہا
وہ بانہوں میں میری مچلتا رہا

شبِ وصل کی جو سحر ہوئی
نگاہوں میں برق و شرر ہوئی

جو خلد اور دوزخ میں اعراف ہے
وہ دونوں کے مابین اک ناف ہے

زمانہ ہوا میرے فن کے خلاف
مرے کعبۂ دل کا ہے یہ غلاف

زمانے کے ہاتھوں ہوئے سنگ سار
مگر پھر بھی اترا نہ فن کا خمار

بدن کا فلک آج پابوس ہے
جہنم کی باہوں میں فردوس ہے

بدن کا جو شیشہ نما رقص ہے
مچلتی ہوئی روح کا رقص ہے

وہ ناگن لگی ہے حسینہ مجھے
دیا جس نے فن کا نگینہ مجھے

بدن کی زمیں پر وہ کیا قوم ہے
کہ روحوں کے ہاتھوں میں جو موم ہے

یہ دل ہے تصوّر، نظر عکس ہے
خدا کا مگر ہر بشر عکس ہے

نہ تھی تاب موسیٰ میں دیدار کی
یہ بس میں نہ تھا ذوق نظّارگی

جب آدم خودی سے شناسا ہوا
خدا آگہی سے شناسا ہوا
وہاں کیا چلے مکر ابلیس کا
سلیماں جہاں دل ہو بلقیس کا

مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں
خلوصِ وفا جس کی فطرت نہیں
مرا نفس دوزخ کی جانب گیا
بھرا جام آتش کا میں نے پیا

میں رندوں کی مجلس میں جھجکا نہیں
کئی جام پی کر میں بہکا نہیں
تماشائی ہو کر تماشہ بنا
میں ہاتھوں میں سب کے کھلونا بنا

میں دانشوروں میں بھی جاہل رہا
جہالت پہ یوں اپنی عامل رہا
فراست کی دنیا ہوئی یوں ذلیل
بنی اپنی ذلت پہ خود ہی دلیل

جو ہو ہر شرابی خود اپنا کفیل
تو پھر میکدے میں نہ مے ہو قلیل
تعصب میں جو لوگ اندھے ہوئے
اجالے بھی ان کے اندھیرے ہوئے

برہنہ ثقافت کی دیوی ہوئی
تو دنیا کی تہذیب ننگی ہوئی

جو مخدوم تھے آج خادم ہوئے
نظامِ زمانہ کے ناظم ہوئے

بنی ذہنِ انساں پہ جو بار ہے
وہ دنیا کی تصویرِ افکار ہے

وہ ہستی تخیل کا سایہ نہیں
جسے خواب میں ہم نے دیکھا نہیں

جو قابیل کے سر پہ غالب ہوا
وہ ہابیل دھرتی پہ نائب ہوا

جو آغوشِ مریم کا پالا ہوا
زمانے میں بول اس کا بالا ہوا

جو آغوشِ مریم کا صاحب ہوا
صلیبوں کی باہوں میں راہب ہوا

گناہوں کی ناگن پجارن ہوئی
جو عصمت کی دیوی بھکارن ہوئی

جو رقصِ چراغاں ہوا رات بھر
تو شعلوں کی زد میں رہے بام و در

ہمیں بھائی پھر بھی تمہاری بسنت
تھے راہوں میں اس کی اگرچہ مہنت

تو پستی میں رہ کر ہمالہ نہ دیکھ
یہ دیر و کلیسا و کعبہ نہ دیکھ
جو حق کے جہاں میں گرو ہوگیا
نفس کی تپسّیا میں وہ سو گیا

ہوئی خود نمائی پہ قوموں میں جنگ
نہیں آدمی کو زمیں پھر بھی تنگ
زن و زر ہے لوگوں کا ایمان آج
انا کا ہوا ختم عرفان آج

جو بیت المقدس نظر میں نہیں
تو گھر والے خود اپنے گھر میں نہیں
نصاریٰ یہودی بھی انسان ہیں
خدا کے بہت ان پہ احسان ہیں

زمیں پر جو انسان ہے بھیڑیا
لہو اس نے اپنے بدن کا پیا
جو باطن تھا باطن سے باہر ہوا
جو اندر کا انساں تھا ظاہر ہوا
جو باطن تھا انساں کا ظاہر ہوا
وہ اپنے نفس پر نہ قادر ہوا

نظر میں تمہاری کوئی خیر ہے
زمانے سے گرچہ تمہیں بیر ہے

ہمیں خُلد سے جب نکالا گیا
تو فطرت کے سانچے میں ڈھالا گیا

مری لغزشوں کا بڑا ذکر ہے
زمانے کو میری بڑی فکر ہے

درِ میکدہ پر بلا نوش ہیں
وہ سائے میں ساقی کے پُر جوش ہیں

نمایاں رہے تھے جو دربار میں
سمائے ہیں خود آج دیوار میں

خیالوں کی دیمک نے چاٹا مجھے
کہ کاغذ کے ٹکڑوں میں بانٹا مجھے

قلم تھے کبھی اپنی بیساکھیاں
جو عریاں تھیں لفظوں کی شہزادیاں

جو اپنا لہو پی کے چسکا پڑا
شب و روز پھر اس کا لپکا پڑا

سمندر پہ اِبلا[1] چڑھاتے تھے لوگ
یونہی زندگی کو بڑھاتے تھے لوگ

زمانے میں آئے ہیں جو بھی رسول
زمانے نے ان کو کیا ہے قبول

۱۔ [illegible]

ہیں قدموں کے نیچے ہمارے اصول
کہ خاروں کے دامن پہ رقصاں ہیں پھول
یہاں پر مرا تبصرہ ہے فضول
بھلائی کی باتیں پکڑتی ہیں طول

بدن جو مرا صیدِ آشوب ہے
مری روح بھی قیدِ آشوب ہے
تھی میری صدیوں سے آغوش ہے
کہ وہ سیم تن آج خاموش ہے

گلے میں تمہارے جو بھگوان ہے
تو سینے میں نغموں کا طوفان ہے
ہے گو غم کی بُلبُل بھی ماری ہوئی
خوشی پھر بھی رسوا ہماری ہوئی

جو میّت سے اپنی اتارا کفن
وہ باطن کے زخموں کا تھا اک چمن
جو دانش کا دامن ہُوا آج پاک
تو وحشت کے سر پر پڑی اُڑ کے خاک

جُنوں کا گریباں رفو کیجئے
لہو سے ہمارے وضو کیجئے
پکڑ کر اسے دو بدو کرلیا
جو شیشے کو اپنے عدو کرلیا

جہاں پھول زخموں کے کھلنے لگے
وہیں چاک سینے کے سلنے لگے

ہوئے خار آنکھوں میں اپنے عزیز
ہے رقصاں چمن میں بدن کی کنیز

بہاریں ہیں گلشن میں سمٹی ہوئیں
کہ سانسیں ہیں سینے میں اٹکی ہوئیں

کفن ہے یہ شبنم کا گلزار پر
کہ اک ابر چھایا ہے کہسار پر

خزائیں خزاؤں میں کھو جائیں گی
بہاروں کی آمد پہ سو جائیں گی۔

جو میلہ غزل کا لگایا گیا
تو سازِ تخیّل بجایا گیا

سرِ حشر میں نے کیا اعتراف
نہیں تھا گنہ سے مجھے انحراف

جو سوزِ تقدس میں جلنے لگا
گناہوں کے در پر مچلنے لگا

میں شعلوں سے دامن بچاتا رہا
مگر سینہ ان سے جلاتا رہا

بدن کا سرِ دار لایا خیال
کہ جذبے کی زد پر تھا بچنا محال

جو دستِ مروّت بھی کٹ جائیں گے
سمندر اناؤں کے پھٹ جائیں گے

کہاں ہیں اناؤں کے پیغامبر
لٹے جا رہے ہیں اناؤں کے گھر

کیا تم نے نیلام اقبال کو
چلے تو کہاں لے کے اس چال کو

ہر اک آدمی جس کا ممنون ہے
وہ دنیا میں الفت کا قانون ہے

ہے یوں اہلِ دانش کا دنیا میں کال
کہ یہ دور ہے دورِ قحط الرجال

جہالت کو حاصل ہے ایسا کمال
لرزنے لگا ہے جہاں ہر خیال

ہے دستِ قلم میں یہ لفظوں کی ڈھال
کہ آیا ہے کاغذ کے شیشے میں بال

نہ پوچھو کوئی ہم سے ایسا سوال
اتر جائے جس سے صداقت کی کھال

محبّت کو جب وہ پرکھنے لگے
تو سینے میں پھر دل دھڑکنے لگے

رہا اک کھلونا کھلونے کا رنگ
نہ آئے مصّور کو صنعت کے ڈھنگ

مسرّت کی جانب ہے جو گامزن
نہ ہوگا کوئی اس کو رنج و محن

عناصر میں بڑھنے لگی کشمکش
فلک سے اتر آیا جب التمش

رقابت عناصر میں بڑھنے لگی
ہدایت فلک سے اترنے لگی

ملاقات جس سے اچانک ہوئی
وہی چاندنی پھر بھیانک ہوئی

کلیسا سے جس کو نکالا گیا
وہی پادری پھر شیوالہ گیا

جو حِس کی لطافت سے عاری ہوا
وہ روحِ گلستاں پہ بھاری ہوا
رگوں میں لہو جس کے جاری ہوا
نظر میں وہ واعظ کے ناری ہوا

جو خواجہ کے منصب پہ تھا جلوہ گر
اسی سے فروزاں تھا نورِ سحر
اسے امتحانوں میں ڈالا گیا
یہاں تک کہ گھر سے نکالا گیا

جو دستِ مصوّر میں تیشہ رہا
وہ پتھّر پہ راضی ہمیشہ رہا

جو قاتل زمانے میں قاضی رہا
اجل کے بدن پر وہ راضی رہا
ثقافت اتر آئی کوٹھے سے آج
شرافت سنور آئی کوٹھے سے آج

منادر میں رقصاں ہے رادھا کی لاج
کہ اس کا بنا ہے لٹیرا سماج
لہو سے برہمن کا اشنان ہے
یہ روح و بدن کا بلیدان ہے

جو پستی میں انساں ریا کار تھا
گلے کا غُلامی کے وہ ہار تھا
تھی فطرت کی بخشی ہوئی جو قماش
ازل سے رہا وہ ہمیشہ نراش

برہنہ پڑی ہے ضمیروں کی لاش
کہاں کھیلنی ہے مروّت کی تاش
جو انساں کی تصویر رنگین ہے
مصوّر کے ہاتھوں میں سنگین ہے

ہے چھایا ہوا زندگی پر جمود
کہ شاید ثقافت کی آئیں حدود
بپا گرچہ فوجوں کی یلغار ہے
غریبوں کی دھرتی پہ للکار ہے

ضرورت کا ویران بازار ہے
پریشان یوں ہر خریدار ہے
نہیں کھڑکیوں میں کوئی روشنی
نہ آنگن میں رقصاں کوئی زندگی

جہاں بھی کوئی مجھ سے غفلت ہوئی
مجھے اپنی دانش سے نفرت ہوئی
نہاں ہم سے ہے گر شہود اور غیب
ہمارا ہنر بھی ہے دنیا میں عیب

اجل بن کے آئے ہو گھر پر مرے
غموں کا ہے تابوت سر پر مرے
زمانے میں رونے کا دستور ہے
کہ ہنس ہنس کے جینا بہت دور ہے

جو خواہش کا پتلا جلاؤں گا میں
تو پردہ انا سے اٹھاؤں گا میں
ہیں آسیب اپنے مکانوں میں آج
کہ ویرانیاں ہیں دکانوں میں آج

جو تیشے سے اپنے ہوا سر میں چھید
ازل کا کھلا آج دنیا میں بھید
خودی قید خانوں میں آزاد ہے
کہ قلب و نظر میں وہ آباد ہے

مرے پاؤں میں غم کی زنجیر ہے
خوشی کی مگر سر میں تدبیر ہے

نہیں موت کا بھی جہاں پر گزر
گزرتی ہے اس موڑ سے بھی نظر

گلابوں میں رقصاں ہے رُوحِ شرر
کرے کوئی خاروں سے کیا اب حذر

نگاہوں میں اس کے بڑا سوز تھا
اسے واسطہ اس سے ہر روز تھا

جو لونڈی ترے گھر کی عظمت ہوئی
طوائف بھی کوٹھے سے رخصت ہوئی
جو زخموں کے پھولوں سے زینت ہوئی
گلوں کی گلستاں میں قیمت ہوئی

جو قاتل کو خنجر کی زحمت ہوئی
تو مقتل میں اس کی یہ قسمت ہوئی

جو رسوائی اس کا مقدّر نہ ہو
تو ہاتھوں میں شیشے کے پتھّر نہ ہو

سرِ دار آکر پریشاں نہ ہو
اجل کی محبّت پہ حیراں نہ ہو
یہ ممکن نہیں اس کا امکاں نہ ہو
شراروں میں شاید گلستاں نہ ہو

جو مقتل میں قاتل سے جا کر ملو
نشہ بن کے آنکھوں میں اس کی کھلو
وہ سیما بدن کوئی کم سِن نہیں
بتاتی ہے یہ اس کی روشن جبیں
وہ پتھّر کی دھرتی پہ مورت ہوئی
جو شیشے کی مانند صورت ہوئی
جو بولی ضمیروں کی خود بولتا
خودی کی ترازو میں پھر تولتا
یہ اقوامِ عالم کا منشور ہے
مروّت کی دنیا بہت دور ہے
سر بزم ہوتی نہیں حاضری
لبوں پر ہے رقصاں مگر شاعری
وہ نکلیں گے ایسے یہ سوچا نہ تھا
کہ آئینے میں خود کو دیکھا نہ تھا
غموں کی جو بستر سے شکنیں چنیں
بوقتِ سحر پھر اذانیں سنیں
لبوں پر ہیں رقصاں دعائیں کہیں
برہنہ ہیں شاید نوائیں کہیں
جو شاہوں نے شاہوں کو دھوکا دیا
فلک نے انہیں آج رُسوا کیا

جو منبر سے لاشوں کے اترے نہ تھے
قدم خون سے سرخ اُن کے نہ تھے

میں خلاقِ عالم کا شہکار ہوں
ہے ایسا تو پھر کیوں سیہ کار ہوں

جو اپنی نظر میں رہے ہیں فقیر
بنایا گیا ہے انہیں بھی امیر
یہ پتھر پہ کھینچی ہے کس نے لکیر
کرن بن گیا آج کس کا ضمیر

نہیں ہے کہیں پر تمہاری نظیر
تمنا کی دُنیا میں ہو تم فقیر

بدن پر کفن ہے جو تہذیب کا
سبب ہے تمدّن کی تخریب کا

بشر ہی سے قائم ہے یہ کائنات
خدائی کو حاصل ہے اس سے ثبات
برہنہ ہے گلیوں میں روحِ حیات
زباں پر رہی ہے ادھوری سی بات

ملی ہے ہمیں زندگی کی سزا
لبوں پر ہے مرنے کی رقصاں دعا
فضا میں جو گونجی ہماری صدا
سماعت کے گنبد میں ٹھہری نوا

انہیں تو فقط سیم و زر چاہئے
نہ پا کی ضرورت نہ سر چاہئے
نہیں آج قابو میں اپنے حواس
جنوں میں نہ کام آیا اپنا قیاس

فلک پر گھٹائیں بھی آتی رہیں
برس کر زمیں پر وہ جاتی رہیں
جو صحرا کو گلشن بناتی رہیں
وہ کھیتوں میں سونا اگاتی رہیں
کسانوں کو کندن بناتی رہیں
بہاروں کو چھو کر جگاتی رہیں
بہاروں کا منظر دکھاتی رہیں
خزاں کو چمن سے بھگاتی رہیں

بدن آج شعلوں میں کیوں برف ہے
کہ روحوں کا دنیا میں یہ ظرف ہے
لہو چشمِ تر سے برسنے لگا
تو دل آنسوؤں کو ترسنے لگا
جو خوابوں کی دنیا میں بسنے لگا
تو احساس کژدُم سا ڈسنے لگا

میں شعلوں کی جانب لپکنے لگا
یہ زہرِ حوادث دہکنے لگا

عداوت کا جو ناگ پلنے لگا
وہ زہر اپنا آخر اگلنے لگا

رقیبوں کو سر پر بٹھاتا رہا
محبت مَیں اپنی جتاتا رہا
شَرر آنسوؤں کو بناتا رہا
میں دامن کو اپنے جلاتا رہا

جو موجوں سے کشتی بچاتا رہا
وہ طوفاں سے نظریں ملاتا رہا

مجھے شب کی ناگن جو ڈستی رہی
کسوٹی پہ غم کی وہ کستی رہی

جب انسان دنیا میں حاکم ہوا
وہ جاہل ہوا اور ظالم ہوا

محبت کے مرگھٹ کے ناظر بنے
یہ لیلیٰ و مجنوں بھی شاطر بنے
جو اہلِ ہوس آج شاعر بنے
وہ فنِ حماقت کے ماہر بنے

سزا بن گیا ہے مرا اعتراف
کہ رہبر بنا ہے مرا انحراف

نہ دانش کدوں میں ہے رقصاں لہو
کہ رسوائیاں ہیں مری کوُ بکو

فلک جب سے ٹھہرا ہے میرا عدو
زمیں پر پٹخنے لگا میں سبو
نہیں ہے گلوں میں کوئی رنگ و بو
میں شبنم سے کرتا رہا ہوں وضو

عمل کی زمیں پر جو عامل ہوا
فلک کی نظر میں وہ کامل ہوا
جہاں غم کا طوفان ساحل ہوا
سکوتِ تموّج پہ مائل ہوا

سرِ دار آکر جو قائل ہوا
وہ اپنی ہی باتوں سے گھائل ہوا
جو موت آئی کانٹے بدلتی ہوئی
تو آنکھوں میں آئی مچلتی ہوئی

بڑا سوگ پرور تھا یہ رتجگا
سرِ شام محشر تھا جس کا بپا
ہے عرفاں کی بنیاد دیوانگی
مرے کام آئی ہے آوارگی

جو غربت میں بھی بندہ پرور ہوئے
خدا کے وہ دُنیا میں مظہر ہوئے
فلک نے اڑایا ہے ان کا مذاق
کہ جن کے دلوں میں رہا ہے نفاق

اکڑ کر خدا کی زمیں پر نہ چل
یہاں تو فلک کے نکلتے ہیں بل
نہ بدمست ہو اپنے قدموں پہ چل
درِ میکدہ پر مچل کر سنبھل

خدا تک جو اپنی رسائی نہیں
تو قبضے میں اپنے خدائی نہیں

مجھے پارسائی جتاتا رہا
وہ اپنے نفس سے جلاتا رہا

کسانوں کا ماضی میں یہ حال تھا
کہ ہر شے کا ان کے لئے کال تھا

وہ نانِ شبینہ سے محروم تھے
کہ بے روزگاری کا مفہوم تھے
گناہوں کی دھرتی پہ مرقوم تھے
جو بچّوں کی مانند معصوم تھے

اکیلا جہاں آج سلطان ہے
یہ زیرِ فلک ایسا ملتان ہے

بھرم ہے جو رنگوں کا حسنِ لطیف
اسے کہہ رہے ہو حقیر و کثیف

جو لمسِ محبّت میں گرمی نہیں
زبانِ ثقافت میں نرمی نہیں

جو اپنی محبّت ہی طینت رہی
وہ روح و بدن کی بھی زینت رہی

بچایا ہے میں نے تمہارا سہاگ
اگرچہ بھڑکتی تھی آنکھوں میں آگ
کبھی دیوتا تھا یہی شیش ناگ
کہ جس سے ملے پتھروں کو بھی راگ

میں لفظوں کے دھوکے میں آتا نہیں
کہ مشروط بزموں میں جاتا نہیں

نظر دیکھ کر جس کو مجروح ہے
وہ فنکار دراصل بے روح ہے

فقط خود نمائی ہے جن کا ادب
کہا کیسے جائے انہیں با ادب

جو اپنے ہی رستے کی دیوار ہے
نظر میں ہماری وہ بیمار ہے

بھروسہ نہیں ایک پل کا یہاں
کہ یہ بزمِ عالم نہیں جاوداں

سبیلوں پہ پہرا لگایا گیا
غریبوں کو تشنہ نچایا گیا

کھلونا ہے دستِ اجل میں حکیم
چلے تپتے صحرا میں جیسے نسیم

ہوئی جب سے بے سوز فکرِ سخن
غزل گوئی ہے مرثیہ خوانِ فن

غلاموں کے ٹھہرے ہیں آقا غلام
فلک جھک کے کرتا تھا جن کو سلام
مسلماں کے دیکھو رکوع و قیام
کہ خالی ہے فکر و نظر سے نیام

غزل کی زمیں بن گئی لالہ زار
کہ آئی ہے دوشِ خزاں پر بہار
کہاں ہیں گلستاں کے پروردگار
گلستاں ہے دھرتی پہ سینہ فگار

جو کھویا ہے مسجد کا تم نے وقار
ضمیروں پہ لوگوں کے ٹھہرے ہو بار

جہاں روشنی روشنی سے ملی
وہاں زندگی زندگی سے ملی

یہاں پر نہ تھی رنگ و خوں کی تمیز
نہ روحیں یہاں تھیں کسی کی کنیز

نزاکت کو سر پر بٹھایا گیا
جہاں اک بدن کا بسایا گیا
سرِ دار جب اس کو لایا گیا
ضمیروں کو تیشہ دکھایا گیا

غلاموں کو آقا بنایا گیا
تو شاہوں کو احساں جتایا گیا

کروں پیش کیا میں سرِدار آج
نہیں درمیاں کوئی دیوار آج

سمندر میں سورج ہوا ہے غروب
لگا ہے نظر کو یہ منظر بھی خوب

جو دیکھی زمیں پر قیامت بپا
تو ہر فتنہ ساماں پشیماں ہوا

جہاں میں عناں گیر، شمر و یزید
وہاں ہے شرافت امیر و شہید

مسلماں کے ہاتھوں ہے زخمی حسینؓ
نبیؐ کا جگر گوشہ و نور عین

کفن میں ہے عریاں وفا کا شہید
پریشاں ہوئے جس سے خواجہ فریدؒ

جو سلطان باہوؒ نظر میں رہے
تو سب فقر کی رہ گزر میں رہے

یہ اربابِ دانش کا اعلان ہے
کہ باہوؒ فقیروں کا سلطان ہے

1۔ خواجہ غلام فرید 1845ء میں پیدا ہوئے۔ 24 جولائی 1921ء وفات پائی۔

2۔ حضرت سلطان باہو 1039ھ بمقام تحصیل شورکوٹ ضلع جھنگ میں پیدا ہوئے۔

بدن کے جو معبد کا محرم نہیں
وہ روحوں کی دنیا میں بے غم نہیں

جو شعلوں کی بانہوں میں وہ سرد تھا
تو چہرہ ہوس کا خسِ زرد تھا

وہ وحشت کی باہوں میں لایا مجھے
دریدہ بدن پھر دکھایا مجھے

سرِ بزم تنہا کیا ہے مجھے
نیا زخم اس نے دیا ہے مجھے

چمن میں تمہارے میں گُل بوس تھا
میں خاروں کے لب پر مگر اوس تھا

سرِ شاخ کوئی نہ پتّا رہا
خزاں کا گلستاں میں چرچا رہا

میں شہرِ غزل میں بھی تنہا رہا
کسی دل میں خاموش بیٹھا رہا

میں لوگوں کے چہروں کو پڑھتا رہا
تو پڑھ پڑھ کے مضمون لکھتا رہا

مُسرّت کے گھر میں جو غمگین تھی
سہاگن بھی وہ ہم کو بیوہ لگی

اگر کوئی عزّت کا خواہاں ہوا
تو رسوائیوں کا وہ عنواں ہوا

ہوں روزِ ازل سے مجسم سوال
جواب اس کا لیکن ابد تک محال

عبادت کے جو لوگ ماہر ہوئے
مزارِ عقیدت کے زائر ہوئے

خود اپنی لحد کا مجاور ہوں میں
محبّت کی دھرتی کا شاعر ہوں میں

جو روشن رہے گا لہو سے چراغ
تو شاعر کا ہوگا اجاگر دماغ

جو واعظ کے ہاتھوں سے ٹوٹا ایاغ
ملا پھر نہ رندوں کا کوئی سراغ

ہے بیوہ کے چہرے پہ گردِ ملال
ثقافت کا اپنی یہی ہے زوال

نہ پوچھو کسی سے زمانے کا حال
کہ انساں ہے دھرتی پہ ناطق سوال

چلی میرے باطن نے کیسی یہ چال
کہ صحرا میں لایا مجھے اک خیال

تخیّل میں جو شخص آباد ہے
محبّت کی دنیا میں برباد ہے

جو بدلی ہوئی ہے فضا گاؤں کی
نہ بھائی کسی کو ادا گاؤں کی

ملا تھا کبھی جو مجھے اجنبی
خیابوں میں ٹھہرا مری زندگی

جو غیروں کی باہوں میں اپنا لگا
مرے گھر وہ آکر پرایا لگا

جو طاقت کی ٹھہرے علامت عوام
بدل جائے گا پھر یہ خونی نظام

عوامی عدالت میں پرویز ہے
لہو سے جو رنگین تبریز ہے

بدن کو نہ لائیں ابھی درمیاں
کہ روحوں کا باطن ہے ہم پر عیاں

جو شبنم میں جلنے لگا ہے قفس
نشیمن کی باقی رہے کیا ہوس

سمجھتے ہیں جس کو ہم ادنیٰ کنیز
سرِ دار ہے وہ بدن کو عزیز

جو اپنے چراغوں سے نکلا دھواں
ستاروں کی وہ بن گیا کہکشاں

اگرچہ ہے رستے میں حائل حرم
چلے آرہے ہیں دلوں میں صنم

عیاں اس سے ہوگا تمہارا شیم
کرو گے جو ہم پر نگاہ کرم

تم اپنے قلم کا کرو سر قلم
ہے مضمر اسی میں قلم کا بھرم
جو کاغذ کی دھرتی پہ رکھو قدم
کرو داستانِ محبّت رقم

سہارا ہیں جیون کا رنج و الم
کرم ہیں کرم ہیں کرم یہ ستم
سروں کو کرو تج اپنے قلم
قلم کا رہے گا اسی سے بھرم

گناہوں کا اس درجہ پھیلا دُھواں
کہ اس میں نہاں ہوگئیں نیکیاں
جو آیا ہے انساں برہنہ یہاں
وہ پردوں کی دنیا میں جائے کہاں

جو طوفاں کی باہوں میں سویا رہا
وہ راحت کی دنیا میں کھویا رہا

جو اشکوں میں اپنے حرارت نہ تھی
تو دامن میں ان کے بھی حِدّت نہ تھی

گناہوں نے بخشا وہ سوزِ عمل
کہ ہر فعل اب ہوگیا ہے اٹل

جو آنکھوں میں وہ جگمگانے لگے
ہم احساس کا نور پانے لگے

سردار جو مسکراتا رہا
صداقت کا رتبہ بڑھاتا رہا

تری موت کا ہے جہاں منتظر
وہ کہتے ہیں تو نوکِ خنجر پہ گر

جو روز ازل سے میں بے چین ہوں
تو جلووں کی دنیا میں بے نین ہوں

جو نغمہ کسی دل میں بے چین ہے
لبوں پر مُغنّی کے وہ بین ہے

حسینوں میں مجھ کو بھی چاہا گیا
میں دھرتی پہ جنّت سے لایا گیا

فرشتوں کو مجھ سے شکایت رہی
مرے دل میں پنہاں بغاوت رہی

ہَوس کے جہاں میں ہوں مشہور میں
محبّت کی دنیا سے ہوں دور میں

مری فکر کا گرم بازار ہے
جہاں میرے فن کا خریدار ہے

ازل سے یہ دنیا کی حالت رہی
کہ ہر آن برپا قیامت رہی

کلیسا سے لایا میں اک راہبہ
رفیقہ ہے میری وہی صاحبہ

میں عورت کو جنّت سمجھتا رہا
مرا ذہن اس سے مہکتا رہا
خراشوں سے بھی چور ہوگا بدن
کہ ہے سخت بستر کی ہر اک شکن

ہیں دنیا کے جتنے نشیب و فراز
میں سب جانتا ہوں، نہیں مجھ پہ راز
قلم کی نہ رکھی کسی نے بھی لاج
ہوئے خوار دنیا میں فنکار آج

جو قاتل تھا لمحوں میں محسن ہوا
نظر میں ہماری وہ مومن ہوا
شرابی کو زاہد بتایا گیا
کہ رہزن کو قائد بتایا گیا

لہو کے یہ دھبے ہیں تاریخ پر
کہ دنیا ہے تپتی ہوئی سیخ پر
جو میخیں ہیں ہاتھوں پہ گاڑی ہوئی
تو حکمت کی رنگین ساڑی ہوئی

نگاہوں میں جس کے تھی نیلم پری
نہ راس آئی اس کو کبھی دلبری
جب ایمان و دیں کی تجارت ہوئی
تو دنیا خسارے میں غارت ہوئی

اجاگر رہے جن کے لیل و نہار
وہ انساں تھے اعجوبہ روزگار

دیا زہر بیٹے نے اب باپ کو
کچھ احساس اس کا ہوا آپ کو

ملی جس کو دنیا میں پیغمبری
عمل آج اس کا ہے جادوگری

غلاموں میں جب سے بغاوت ہوئی
تو آقاؤں کی ختم ثروت ہوئی

سرِ شام بازار سنسان ہیں
کلب شہر کے سارے ویران ہیں

ہوس نے کیا سب کو رسوا یہاں
مُحبّت ہوئی آج عنقا یہاں

یہ لِکھّا ہے لوگوں نے دیوار پر
کفن ڈالئے مردہ افکار پر
مسیحا کو لائے ہو تم دار پر
کرو رقص اب نوکِ پرکار پر

سڑک پر سڑی جب مروّت کی لاش
تو انسان کا ہو گیا راز فاش

جو پہنے ہوئے ہیں ہوس کا لباس
مروّت ہے ان کی نظر میں اداس

نگاہوں کی دیوی جو بے مہر تھی
وہ ہر دیوتا کے لئے قہر تھی
نہ چھلکایئے اپنا بھر کر گلاس
ابھی تک ہے باقی نگاہوں میں پیاس

زمیں پر فلک کو اتارا گیا
تو جذباتِ کو دل میں ابھارا گیا
فضاؤں میں چیلیں نظر آئی ہیں
بلائیں فلک سے اتر آئی ہیں

بتائیں کسے اپنا پیرِ مغاں
کہ ہر پیر ہے اپنی ضد میں جواں
اگر خود غرض کوئی بالفرض ہے
نہ کچھ طول اس کا نہ کچھ عرض ہے

ہے انساں کے ہاتھوں میں نبضِ حیات
مسیحا کی کیسے ڈھلے گی یہ رات
محبّت کے در پر جو دستک ہوئی
ہر اک شخص سے آج بک بک ہوئی

لہو پی کے جو پاک دامن رہا
وہ سیتا کی آنکھوں میں راون رہا
اٹھا قولِ حق رہ گئے قیل و قال
مٹا امتیازِ حرام و حلال

نہ کام آئے گی خود ستائی یہاں
کہ ہے جرم اب لب کشائی یہاں

یہ مقتول و قاتل بھی ٹھہرے غریب
نہ آئے کوئی آج ان کے قریب

پشیماں ہے کیا آج اپنا حبیب
جو آیا ہے در پر ہمارے رقیب

اگر چیخنے میں ترنّم نہیں
تو کوئی تکلّم تکلّم نہیں

بنامِ خدا لوٹ لیتے ہیں لوگ
کفن کی جگہ سوٹ لیتے ہیں لوگ

جو ویران ناری کا پنگھٹ ہوا
محبّت کا گویا وہ مرگھٹ ہوا

لگا کب سے تم کو محبّت کا روگ
کہ ہیں سوگ میں اب محلّے کے لوگ

لبوں سے ہوئے آج زخمی جو گیت
چلی پھر زمانے میں واعظ کی ریت

جو لاکھوں کا مجمع لگایا گیا
تو آدم کا قِصّہ سنایا گیا

فرشتے فلک پر ہوئے خندہ زن
جب آدم کا دنیا میں اجڑا چمن

ہوا سے ہے زخمی جو اب نسترن
نہ شبنم کا اس کو ملے گا کفن

نگاہوں میں جن کی ہیں رقصاں کلب
ہے آباد ان کے دلوں میں بھی رب
دہائی کا اس کی بنا یہ سبب
جو آیا محبّت پہ اس کی غضب

اگرچہ ترے پاس ثروت نہیں
یہ کیا ہے کہ تجھ میں مروّت نہیں

نہیں ہے بھرم کوئی افلاس کا
جنازہ نکالو اب احساس کا

کلی جب محبّت کی کِھل جائے گی
تو گلشن کی دیوار ہِل جائے گی

فلک کی طرف خوں اچھال گیا
تو دھرتی کو اس سے اجالا گیا

فلک بھی کبھی جس کا ہمدوش تھا
سرِ دار وہ آج خاموش تھا

کوئی پڑھ رہا تھا خدا کا کلام
لبوں پر تھا اس کے محمدؐ کا نام
یہاں کون کرتا ہے کس کو سلام
کہ دنیا میں مطلب پرستی ہے عام

سرِ دار آیا ہے چل کر امام
بدل جائے گا خود ہی کہنہ نظام
کہ بیٹھا ہے کب سے کوئی تشنہ کام
اٹھا ساقیا اپنے ہاتھوں میں جام

یہ میخانۂ دہر کا ہے نظام
کہ اس میں ہوئی پارسائی حرام
ہو اگر کوئی مال و زر کا غلام
زمانے میں رسوا رہے گا مدام

کُھلا جس کی پلکوں پہ گلزار تھا
قدم بوس اس کا ہر اک خار تھا

کبھی نام سن کر لرزتے تھے لوگ
نہیں موت پر بھی کوئی اس کے سوگ

یہ دنیا بہر حال دنیا ہوئی
یہاں چڑھتے سورج کی پوجا ہوئی

سروں پر جو پتھّر برسنے لگے
وہیں پھول اشکوں کے ہنسنے لگے
جب انسان آپس میں بٹنے لگے
تو پردے نگاہوں سے ہٹنے لگے

جو اشکوں سے شیشوں میں ڈھلنے لگے
تو دامن محبّت کے جلنے لگے

ہوئی آج رقصاں جو مقتل میں موت
ہر اک گھر نے سن لی قیامت کی صوت

سر دار اس کا کھلا ہے دشمن
کہ کالا ہوا ہے زمانے کا من

اجل سے ہے وہ آج چمٹا ہوا
خیالات میں اپنے سمٹا ہوا

جو منظر ہے اک خون کا سین ہے
کہ ہر پیرہن آج رنگین ہے

زمانے کا آئین معلوم ہے
جو عہدِ وفا ہے وہ موہوم ہے

بہت مہرباں ہم پہ صیّاد ہے
کوئی داد ہے اور نہ فریاد ہے

کئے جاؤ پیہم ستم پر ستم
نہ بھولیں گے ہم یہ تمہارے کرم

جہاں فتحِ خیبر پہ حیران ہے
علیؓ کی شجاعت کی پہچان ہے

لبوں پر جو نیزوں کے قرآن ہے
علیؓ آج پھر ان پہ حیران ہے

ہوا قتل ہاتھوں سے جن کے حسینؓ
نہ ہوگا میسّر کبھی ان کو چین

نواسہ محمدؐ کا مارا گیا
نیا روپ دنیا میں دھارا گیا
لہو سے جو مضمون لکھا گیا
بنا بابِ رنگیں وہ تاریخ کا
جہاں خیر و شر ہی کا بازار ہے
کہ جاری ازل سے یہ پیکار ہے
اجل سے سدا مسکرا کر ملو
جُھکا دو سِرِ مست پندار کو
بپا پھر زمیں پر قیامت کرو
خدا کی یہاں پھر نیابت کرو
کہ دامن شرافت کا چھُوٹا یہاں
برہمن نے شُودر کو لوٹا یہاں
زمیں پر مسلماں جو کافر ہوا
وہ قلب و نظر میں بھی جابر ہوا
بظاہر جو غربت میں صابر ہوا
تو باطن میں اپنے وہ شاطر ہوا
جب انسان خود اپنا ناظر ہوا
تو اس پر ہر اک راز ظاہر ہوا
ضیا زینہ زینہ اترنے لگی
تو آنگن میں میرے بکھرنے لگی

کسی کو کسی کی خبر ہی نہیں
ہے کوئی کہیں اور کوئی کہیں

جب آدم طلبگارِ حوّا ہوا
گلے کا وہ خود اپنے پھندا ہوا

جو سورج کی کرنوں میں کھو جائیں گے
وہ ظلمت کی باہوں میں سو جائیں گے

جو دریا ہیں خوں کے اتر جائیں گے
وہ پاتے ہی گوہر ابھر آئیں گے

جو اشکوں کی مالا پرونے لگے
لہو سے وہ دامن کو دھونے لگے

جہاں بھائی کا قاتل ہوا
وہاں کوئی ظالم ہی عادل ہوا

بدن کی زلیخا پریشان ہے
تو روحوں کا یوسف بھی حیران ہے

جو سلطان دنیا میں جاہل ہوا
وہ تقدیسِ عالم کا حائل ہوا

نگاہِ عدالت میں رقصاں ہے قہر
ملا دے کوئی شہد میں جیسے زہر

کیا ہے اماموں کو ہم نے شہید
مسلمان ہو کر بنے ہیں یزید

یہ دنیا میں کتنی ہے روشن دلیل
کہ کرتی ہے عزت مآبی ذلیل
محمدؐ کی نسبت سے افضل ہوئے
جو کامل تھے پہلے وہ اکمل ہوئے

محبّت کی قدریں جو پامال ہیں
سبب اس کا انساں کے افعال ہیں
حقیقت کو ہم نے برہنہ کیا
تو باطل وہیں سامنے آگیا

میں حاضر ہوں مجھ کو سزا دیجیے
خطا کیا ہے میری بتا دیجیے
سرِ دار نغمہ سناتے رہو
مسیحا کو اپنے مناتے رہو

نظامِ فلک یوں ہے بکھرا ہوا
کہ سورج زمیں پر ہے اترا ہوا
لگا جب سے پہرا ہے اظہار پر
ہوئے لوگ آمادہ گفتار پر

کرم بھی ترا قہر بن کر لگا
اثر شہد کا زہر بن کر لگا
اگر اپنا مقسوم بدلا نہیں
حقائق کا مفہوم بدلا نہیں

زمانے میں کیسی یہ تفہیم ہے
کہ انسان انساں میں تقسیم ہے
میں زخموں کی باہوں میں رہنے لگا
تو دشمن بھی شاباش کہنے لگا

زمیں پر ہے پھیلا ہوا انتشار
فلک میں بھی باقی نہیں انکسار
عزائم پہ قُوّت کا ہے انحصار
کہ آتا ہے رخ پر لہو سے نکھار
یہ عالم کچھ ایسے ابھرنے لگے
انہیں دیکھ کر لوگ ڈرنے لگے

میں ترکِ موالات کرنے کو ہوں
رقم اپنے حالات کرنے کو ہوں
ازل سے ہے جاری زمیں پر فساد
نہیں اس میں تخصیص ابنِ زیاد

کسی پر نہیں کوئی رحم و کرم
کہ ہے عالموں کا اسی سے بھرم
اب آئے کسی کو خدا کیسے یاد
کہ ذہنوں میں گھر کر گیا ہے عناد

عبادت کروں کیسے حیران ہوں
برِ معبدِ حق پریشان ہوں

یہ جینے کا بھی کیسا سامان ہے
کہ مرنے کا ہر لحظہ ارمان ہے
جو مرنے پہ اپنے دوالی ہوئی
یہ دنیا محبّت سے خالی ہوئی

گو شہر اولیاؤں کا ملتان ہے
مگر باوجود اس کے سنسان ہے
کسی کی نظر کا یہ فیضان ہے
ہر اک ہاتھ میں غم کا گلدان ہے
حقائق سے پردہ سرک جو گیا
تو ہر راز ہم پر عیاں ہوگیا
یہ کون اپنے گھائل سے ملنے لگا
کہ ہر زخم کا پھول کھلنے لگا
جو کم ظرف تھے وہ بہکنے لگے
شرارے نظر میں دھکنے لگے
خلوص وفا کا لٹا جب شباب
تو دھرتی کا یزداں ہوا آب آب
جو طوفان کی زد پہ شاہین ہے
لبِ اہلِ دانش پہ آمین ہے
ممولے کے ہاتھوں میں شہباز ہے
اسے کون جانے یہ کیا راز ہے

مسیحا کے ہاتھوں پہ توڑا ہے دم
کہ نکلا ہے دنیا میں انساں کا غم

ستم گر جو مائل ستم پہ نہیں
کرم یہ کسی کو میسّر نہیں

گلستاں میں چلنے لگی جب بہار
خزاں آکے فوراً ہوئی سوگوار

پرندہ کوئی آج چہکا نہیں
کوئی جسم خوشبو سے مہکا نہیں

میں آئین لایا جو بازار میں
وہ کانٹا لگا شہر افکار میں

رہے ہیں زمانے میں جو حیلہ ساز
کیا ہے فلک نے انہیں سرفراز

جو قرآں کو سمجھے پرانی کتاب
نیا لائیں گے وہ کہاں سے نصاب

ستارے ہوئے آج اشکوں کے مانند
کہ گہنا گیا ہے نگاہوں کا چاند

لبوں کو لبوں سے ملا دیجئے
حلاوت کو امرت بنا دیجئے

نہ رہ جائے دل میں تمنّا کوئی
ابھی اور ٹھہرو گھڑی دو گھڑی

جو اپنی اجل سے مقابل ہوا
مقام اس کو دنیا میں حاصل ہوا
شکستہ جہاں کوئی ساغر ہوا
تو وہ چوٹ ساقی کے دل پر ہوا

جو شاہوں کو دھرتی پہ لایا گیا
تو کانٹوں پہ ان کو چلایا گیا
ہے اب ذکرِ مردہ اساطیرِ خام
ہے پانی پہ لکھا ہوا ایک نام

لگی چوٹ آدم کے ہر جوڑ پر
نہ ٹھہرا وہ پھر بھی کسی موڑ پر
کہا آج یوں اس نے منہ موڑ کر
چلے جاؤ رشتوں کو تم توڑ کر

نہ پامال ہوں کس طرح تخت و تاج
ملا ہے کمینوں کو دنیا میں راج
سہاگن زمانے میں بیوہ ہوئی
بنامِ ثقافت یہ سیوا ہوئی

زمانے کی تاریخ شاہد ہوئی
کہ معبد میں کبھی بھی زاہد ہوئی
گرے ہیں زمیں پر جو آنکھوں سے اشک
تو آیا ہے ان پر ستاروں کو رشک

ہزار آئیں دنیا میں سینہ فگار
علیؓ ہیں پر اک صاحب ذوالفقار

نہیں کوئی دنیا میں اپنا رفیق
مسائل ہیں دنیا کے اتنے دقیق

بدن جس کا ملبوسِ احرام ہے
حقیقت میں وہ آج بہرام ہے

زمیں آسماں آج چکّر میں ہیں
بغاوت کے آثار لشکر میں ہیں

شہنشاہِ ایران قاتل ہوا
فلاطوں زمانے کا جاہل ہوا

جو زنداں سے آزاد ہونے لگے
وہ قیدی حواس اپنے کھونے لگے

بغاوت کا لوگوں میں امکان ہے
جو روٹی سے محروم دہقان ہے

شہنشاہ جو آج محبوس ہے
ستارہ سکندر کا منحوس ہے

جو فطرت جبلّت بدلتی نہیں
زمیں پر سنبھل کر وہ چلتی نہیں

جو دنیا میں بدنام ملّت ہوئی
ہر اک گام پہ اس کو ذلّت ہوئی

خلوص و وفا کی جو قلّت ہوئی
ریا کی زمانے میں کثرت ہوئی

گھروں میں جو آثارِ آفات ہیں
وہ اپنے عمل کے مکافات ہیں

بشر کا جنوں ہوگیا کیا جواں
کہ زیر و زبر ہیں زمیں آسماں

دکھایا جو یہ دور اقبال کو
نہ راس آئے یہ طور اقبال کو

ہماری نظر میں جو اب غیب ہے
وہ حکمت کے نزدیک کیوں عیب ہے

اگر لوگ خوابوں میں بیدار ہیں
تو وسواس میں کیوں گرفتار ہیں

زمانے میں جو شخص جامیؒ[1] ہوا
خدا کی خدائی کا حامی ہوا

جو اجزائے عالم کے آلات ہیں
حقیقت میں وہ بھی محالات ہیں

جہاں وہ مؤثّر لبِ بام ہیں
وہاں ایک دیوارِ اوہام ہیں

۱۔ مولانا نورالدین عبدالرحمٰن جامی 817ھ میں صوبہ خراسان کی ولایت جام کے ایک قصبہ خرجرد میں پیدا ہوئے۔
وفات بمقام ہرات 898ھ میں۔

یہ کون و مکاں اس کی تخلیق ہیں
حقائق تمام ایک تحقیق ہیں

سرِ میکدہ شیخ سینا[1] ملے
لئے ہاتھ میں جام و مینا ملے

خدا کا کرے کوئی عرفان کیا
کہ ذات اس کی ادراک سے ہے ورا

لبوں سے نکلتی رہی ایک آہ
نہ ہاتھ آئی انساں کو منزل کی راہ

جو سینے میں ہیں داغِ خورشید ہیں
ستارے تمام اس کی تائید ہیں

جو رومی حقائق کا محرم ہوا
خدا پر یقین اس کا محکم ہوا

غمِ جاں کو جس نے کہا ہے حقیر
نفَس کو سمجھتا ہے اپنے شریر

عجب برگساں[2] کا بھی وجدان ہے
خدا کی جو وحدت پہ حیران ہے

1۔ شیخ الرئیس ابو علی الحسین ابن عبداللہ ابن سینا 980ء بخارا کے قریب ایک گاؤں افشنہ میں پیدا ہوا اور 1037ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔

2۔ ہنری برگساں

نگاہوں کے دیپ آج روشن نہیں
کہ ہر پھول گلشن میں سوسن نہیں

مزاروں پہ جھکنا سکھایا گیا
غلامی کا سر یوں اٹھایا گیا

بجھے اس طرح آگہی کے چراغ
کہ ظلمت کدے بن گئے ہیں دماغ

ہوا میکشوں پر جو نازل عتاب
کسی محتسب کا ہے یہ احتساب

بزرگی پہ ان کی جب آیا شباب
حسینوں سے کرنے لگے وہ خطاب

جو انسان ہو کر بھی مغرور ہیں
وہ انسانیت سے بہت دور ہیں

جو فتووں کا کہرام برپا کیا
تو دینِ محمدؐ کو رسوا کیا

جو ساقی کے منصب پہ فائز ہوا
اسے خون رندوں کا جائز ہوا

عبث ہے یہاں اب اجالوں کی بات
اندھیروں کے دریا میں ڈوبی ہے رات

جو قربان ملت پہ اکبرؓ[1] ہوا
تو بے چین ہاتھوں میں اصغرؓ[2] ہوا

زمانے نے دیکھے ہیں ایسے بھی تیر
جو پیوست کرتے ہیں سینوں میں تیر

جو نانا کی اُمتّ پہ دل گیر ہے
اکیلا وہ مقتل میں شبیرؓ[3] ہے

کچھ انسان یوں حق فراموش ہے
فلک پر خدا جیسے خاموش ہے

جو زیر فلک دیکھی عریانیاں
فرشتے ہیں آدم پہ خندہ زیاں

قلق تھا کسی کو نہ اس بات پر
ستاروں کا حملہ تھا بارات پر

جو مر کر جہاں میں امر ہوگئے
زمیں پر وہ اپنی قمر ہوگئے

وہاں کی فضا میں کہاں روشنی
جہاں تیرہ و تار ہو زندگی

1۔ حضرت علی اکبرؓ

2۔ چھ ماہ کا معصوم بچہ جو حضرت امام حسینؓ کے فرزند ارجمند ہیں۔

3۔ حضرت امام حسین علیہ السلام

گلستاں کو جس نے لگائی ہے آگ
وہ گانے لگا عندلیبوں کے راگ

امامت کا منصب ملا جب اسے
فرشتے بھی آدم کے خادم ہوئے

بنامِ محمدؐ جو رحمت ہوئی
تو دنیا بھی انساں کو جنّت ہوئی

ہوس کے قفس میں ہو ہمزاد ہے
نہیں صید ہرگز وہ صیّاد ہے

نواسہ ہے جو مصطفیٰؐ کا حسینؓ
لقب ہے اسی کا شہہِ مشرقین

جو لاشے وہ تنہا اٹھانے لگے
تو اپنا ہی صبر آزمانے لگے

سروں کو کسی نے نہ پھینکا کبھی
کسی نے یہ منظر نہ دیکھا کبھی

فلک سے زمیں پر یہ اترا کون
سروں پر سے اپنے یہ گزرا کون

جو شکل اور صورت میں انسان ہے
[illegible] یہ [illegible] آج حیوان ہے

ہماری زمیں پر جو ابلیس ہے
یہ دنیا اسے مثلِ بلقیس ہے

جمالِ ازل ہی ضیا بار ہے
جہانِ غزل جس سے بیدار ہے
جو دیکھے ہیں فن کے سیاق و سباق
ادب میں اڑاؤ ہمارا مذاق

جو حرفِ شکایت زباں پہ نہیں
کوئی بھی حکایت زباں پر نہیں
جہانِ ادب کے یہ نقاد ہیں
کہ اقلیمِ دانش کے صیّاد ہیں

لہو کے جو ساغر چھلکنے لگے
تو آنکھوں میں شعلے لپکنے لگے
یہ دھرتی کی ناگن جو پلنے لگی
تو گردن فلک کی ڈھلکنے لگی

جو سینے میں خنجر اتارا گیا
لہو سے اسے پھر نکھارا گیا
ستاروں کی گردش رہے گی مدام
اسی میں سحر ہے اسی میں ہے شام

روایت جو سینہ بہ سینہ ہوئی
تو عصمت پسینہ پسینہ ہوئی

برہنہ نظر میں جو سیتا[1] لگی
گوروداس[2] کی وہ کویتا لگی

میں جلتی ہوئی آگ میں یخ ہوں
کہ صدیوں کے سینے میں اک چیخ ہوں

لہو بھی اگرچہ پیالوں میں ہے
یہ دل غرق پھر بھی خیالوں میں ہے

جو اقلیمِ دل کا مہاراج ہے
تری اک نظر کا وہ محتاج ہے

جو رکھتا تھا سر پر مسرّت کا تاج
وہ دینے لگا آج غم کو خراج

مرے لب پہ جس کا قصیدہ ہوا
وہی مجھ سے خاطر کبیدہ ہوا

مری دسترس میں ہیں لوح و قلم
مگر میں گرفتارِ رنج و الم

جو فکر آشنا کار لائل ہوا
اثر اس کا اب تک نہ زائل ہوا

زمانے میں جو لوگ محتاج ہیں
وہی اصل میں شاہِ بے تاج ہیں

1۔ سیتا جو کوشل خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور رام چندر کی دھرم پتنی تھی۔

2۔ گورو داس چیلا

خودی جس کی دنیا میں بے آب ہے
وہی اپنے بستر پہ بے خواب ہے
اجالا بھی جن کو اندھیرا لگا
کوئی ان نگاہوں کو دے نام کیا

جو اپنی سیاست چھپاتے رہے
نظر آئنے میں وہ آتے رہے
صلیبِ وفا پر جو چڑھنے لگا
بلندی کی جانب وہ بڑھنے لگا

کبھی فلسفی کو مداری کہا
کبھی دہر نے اس کو ناری کہا
جو اپنی خودی کو نہیں جانتا
خدا کو بھی ہے کب وہ پہچانتا

ہوئے سرخ رُو تم کفن بیچ کر
نہ شرم آئی ناموسِ تن بیچ کر
زمانے کے رہبر جو عالم ہوئے
جو مظلوم تھے وہ بھی ظالم ہوئے

سمجھتی تھی دنیا جنہیں نکتہ سنج
وہ عالم بھی ٹھہرے بڑے زود رنج
ترا در بھی روضہ کی جالی ہوا
مرا کعبہ دل ہے خالی ہوا

تری یاد میں رات کالی ہوئی
یہ ناگن ہے میری ہی پالی ہوئی

جو مردہ خیالوں کی تصویر ہے
وہ بے رنگ لفظوں کی تحریر ہے

نظر میں ہیں ان کی وہ باریکیاں
اُجالوں میں جیسے ہیں تاریکیاں

نہیں خود جنہیں اپنی پہچان بھی
وہ رکھتے ہیں دنیا کا عرفان بھی

کوئی انقلابی مُفکّر نہیں
کوئی ملک میں اب مُصوّر نہیں

جو رنگ اور نغمہ سے گھائل ہوا
تجارت پہ وہ شخص مائل ہوا

ملا ہے جو شاہوں کی دہلیز پر
وہ بگڑا ہے خوابوں کی دہلیز پر

جو قاتل تھا وہ آج محسن بنا
جو کافر تھا وہ آج مومن بنا

میں واعظ کے گھر جب سے جانے لگا
حقائق سے آنکھیں چرانے لگا

حقیقت سے جو لوگ برہم ہوئے
وہ اپنی انا کے لئے بم ہوئے

جو کمزور زور آزماتے رہے
سرِ دار طاقت جتاتے رہے
مجھے بزم سے کیوں دیا ہے نکال
نہ تھا میں کسی دل کے شیشے میں بال

حقیقت میں تم لوگ فرعون ہو
اگر یہ نہیں ہے تو پھر کون ہو
جب انساں درندوں میں بانٹا گیا
عناصر سے پھر اس کو چھانٹا گیا

سکوتِ نظر میں تلاطم ہوا
خرد سے جنوں کا تصادم ہوا
جو یاروں کی محفل نے مارا مجھے
مری خلوتوں نے نکھارا مجھے

جو مہریں لبوں پر لگائی گئیں
تو خوشیاں زمیں پر منائی گئیں
لٹا ہے کسی کا یہاں پر سہاگ
بنایا ہے نالے کو لوگوں نے راگ

کوئی لاکھ دھارے فراست کا روپ
چھپے گا نہ پھر بھی جہالت کا روپ
کوئی جب کسی کو سزا دیجیے
تو جرم اس کا پہلے بتا دیجیے

جو باطل کی دنیا بکھرنے لگی
تو زلفِ حقیقت سنورنے لگی
ازل سے ثقافت جو رنگین ہے
لبوں پر لہو اپنے نمکین ہے
یقیں کا لہو وقت پیتا رہا
اور اوہام پر اپنے جیتا رہا
جو مائل زر و سیم پر چین ہے
یہ افلاس و غربت کا اک سین ہے
لہو وہ کسی کا بہانے کو ہیں
یہ رنگین منظر دکھانے کو ہیں
ثقافت سے روسی جو ہیں بے خبر
حقیقت پہ ان کی نہیں ہے نظر
جو دستِ سیاست میں ہتھیار ہیں
زمانے کی گردن پہ تلوار ہیں
مداری نے گرچہ تماشا کیا
حقائق سے لیکن شناسا کیا
نمازوں پہ اپنی جو مغرور ہیں
وہ حقانیت سے بہت دور ہیں
جو علم اور حکمت پہ نازاں رہے
جہالت میں پھر بھی وہ غلطاں رہے

نظر میں ہماری جو درویش ہے
وہ راہِ وفا میں ستم کیش ہے

وہ جس فلسفے پہ تمھیں مان تھا
عمل کی فضاؤں میں بے جان تھا
جو فکر و تدبر میں ذیشان تھا
حقیقت میں وہ شخص نادان تھا

مُصوّر نے کھینچی جو تصویر ہے
لہو رنگ ایک اس میں تنویر ہے
سمجھ کر وہ اک کہکشاں کو صلیب
مسیحا کو لے آیا اس کے قریب

سرِ شہرِ فن جس کا چرچا ہوا
وہ بازارِ عالم میں رسوا ہوا
جو گن گن کے انساں بتاتا رہا
وہ انساں کی عظمت گھٹاتا رہا

ہر اک بات جس کی مجھے تھی عزیز
وہ نکلی سرِ شام زر کی کنیز
سڑک پر کوئی آج راہی نہیں
کہ جیسے کوئی راستہ ہی نہیں

ہر اک چیز بازار میں عام ہے
ہر اک چیز کا آج نیلام ہے

جو لالچ کے دریا میں بہنے لگا
قصیدہ وہ شاہوں کا کہنے لگا

تعصّب کا جب ہو گیا وہ شکار
مٹائے مُروّت کے نقش و نگار

دمِ مرگ مجھ کو کیا ہے ذلیل
کہاں ہے تمہارا وہ فکرِ جمیل

بجھائے جو تم نے مزاروں کے دیپ
دکھائی دیئے تم کو اشکوں میں سیپ

حکومت کے بدلے ہوئے ہیں مزاج
ہر اک سے لیا جا رہا ہے خراج

جو انسان اس دور میں ہیں شریف
وہ سب سے ہیں کمزور سب سے نحیف

وہ دستک پہ باہر نکلتا نہیں
اندھیرے میں یہ دیپ جلتا نہیں

جو خونِ صداقت میں تاثیر ہے
اک آدم کے حق میں وہ اکسیر ہے

ہر اک بات پر خود لرزتا ہے وہ
کہ اشکوں کی صورت برستا ہے وہ

رموزِ خودی جو سکھاتے رہے
فضا بے خودی کی بناتے رہے

نگاہوں میں جن کی حیا تک نہیں
وہ انسان بھی سر سے پا تک نہیں

جنہیں صرف آتی ہیں لنترانیاں
معافی کا عرفان ان میں کہاں

جو اشکوں کی مالا پرونے لگے
تو دامن لہو کا وہ دھونے لگے

فلک جن کے قدموں پہ جھکتا رہا
غریبوں کا دل ان سے دکھتا رہا

شہنشہ جہاں سرنگوں ہو گئے
نگاہ جہاں کا فسوں ہو گئے

جب انساں درندوں میں ڈھلنے لگے
تو سانپ آستینوں میں پلنے لگے

کوئی سانپ جس گھر میں بس جائے گا
مکینوں کو اس کے وہ ڈس جائے گا

جو ناراض ہیں میری تنقید پر
وہ اتریں گے کیا فن کی تجدید پر

وہ کانٹوں پہ کیسے رہے گا مگن
کہ زخمی ہے پھولوں سے جس کا بدن

نئے رنگ جن کو پرانے لگے
نظر سے نظر وہ چرانے لگے

افق پر اجالوں کا امکاں نہیں
کہ جینے کا اب کوئی عنواں نہیں
ہر اک شخص اس وقت مایوس ہے
کسی سے کہاں کوئی مانوس ہے
مصائب کے طوفان ٹل جائیں گے
کہ لمحوں میں نقشے بدل جائیں گے
خدا سے بھی جو شخص مایوس ہو
خودی پھر اسے خاک محسوس ہو
اگر تم خدا پر بھروسہ کرو
تو پھر زندگی کو نہ کوسا کرو
نہیں کوئی پورس کا گو ہمنوا
سکندر نہیں پھر بھی اس کا خدا
وہ قادر ہیں جیسے ہر اک چیز پر
ہزاروں ہیں سر اُن کی دہلیز پر
سرِ دار ان کو ہی عظمت ملی
یہ رسمِ وفا جن کے دم سے چلی
غلاموں کے ہوں گے جو روشن دماغ
اندھیروں میں جلنے لگیں گے چراغ
اجالے میں کیسا اندھیرا ہوا
کہ سورج نے بھی منہ ہے پھیرا ہوا

زمیں پاؤں سے جب سرکنے لگی
نظر آسماں کی تھرکنے لگی

ستم گر وفا میں جو ڈھل جائیں گے
تو ہم ان کے گھر سر کے بل جائیں گے

ابھی وقت ہے کچھ سنبھل جائیے
زمانے کی صورت بدل جائیے

ممولے کے پنجے میں شاہین ہے
نیا ہی یہ فطرت کا آئین ہے

زمانے میں ایماں کا فقدان ہے
مگر سب کے ہاتھوں میں قرآن ہے

مُصَدّق[۱] ہے میری نظر میں عظیم
حکومت کو اس نے کیا تھا دو نیم

شہنشاہ جس سے لرزتا رہا
عدالت کی جانب وہ بڑھتا رہا

چڑھیں گے کہیں دارِ خلوت پہ لوگ
کہیں ہو گا خلوت میں روحوں کا بھوگ

نہیں آج موسیٰ کوئی طور پر
مگر ظلمتیں ہیں خدا نور پر

۱۔ ڈاکٹر مصدق۔ ایران

ہوا آج بے طور اپنا کلیم
ملا خاک میں آ کے دُرِّ یتیم

وطن میں ہوا وہ غریب الوطن
بہاروں سے محروم جیسے چمن

سڑک پر رواں ہیں جو جلسے جلوس
ریاضت سے خالی ہیں ان کے نفوس

تہِ دل رہا آنسوؤں کا ہجوم
لہو کے سمندر میں ڈوبے نجوم

نظر آئی دنیا کی دولت جہاں
بِکے علم دیں کے اکابر وہاں

جو فتنے وطن میں جگائے گئے
نہ جانے کہاں سے وہ لائے گئے

جو پہرے بدن پر لگائے گئے
تو وجدان کے بام ڈھائے گئے

جو مسکان ہونٹوں سے رخصت ہوئی
تو روحِ مُسرّت کو فرصت ہوئی

بدن کی جو لذّت پہ مرتے رہے
فنا زندگی کو وہ کرتے رہے

مظالم کی تاریخ انسان ہے
یہ آدم کی قائم وہی شان ہے

اجالوں کے چہرے جو تاریک ہیں
خیالوں کے رستے کہاں ٹھیک ہیں

جہاں بھی فقیہان شہ آگیں ہے
وہ بھر کر پیالوں میں زہر آگیں ہے

جو لاشوں پہ چڑھ کر اترنے لگے
لہو سے وہ دامن کو بھرنے لگے

جو چیز آدمی کے لئے فرض ہے
حقیقت میں اس پر وہ اک قرض ہے

قصیدہ لکھا جس نے بھی قوم کا
لگا ہے وہ بیٹا کسی ڈوم کا

جو شخص اپنے کھیتوں میں بھوکا رہے
تو کیا ناز ہو زندگی پر اسے

جو دوزخ میں جائے گی موسیقیّت
تو جنّت کی ٹھہرے گی محرومیّت

چمن میں جلے گا بہاروں کا روم
ہر اک شاخ پر آ کے بیٹھا ہے بوم

جو اپنے وطن میں ہیں قانون ساز
فضا میں اڑاتے ہیں لفظوں کے باز

جو معبد میں تھے لوگ آئے ہوئے
لگے وہ مجھے زخم کھائے ہوئے

یہ عالم کی گردش کا مفہوم ہے
کہ نیرو بھی مقتل میں مغموم ہے

دکھائے ہیں گردش نے شام و عراق
اکھٹے ہوئے ہیں وفاق و نفاق

جہانِ عجائب میں جو مصر ہے
حقیقت میں اک خطۂ فکر ہے

جو لیلائے زر کا پرستار ہے
وہ مجنوں بھی آج اک ہوس کار ہے

نہ ہو جب کہیں آ گہی کا وجود
تو ہے غیر ممکن خودی کا وجود

جو باطل پرستوں کا معبود ہے
خلیل آشنا کب وہ نمرود ہے

ہمارا کبھی جو نمک خوار تھا
ہمیں سے وہ محفل میں بیزار تھا

یہ تہذیبِ مغرب کا جلوہ کہاں؟
وہ مریم کے دامن کا سایہ کہاں؟

برہمن برہمن سے بڑھ کر ملا
تو اسلام کے سر پہ چڑھ کر ملا

جو سیّد زمانے کے سردار ہیں
وہ اس دور میں پورے عیّار ہیں

عمل کا یہ رستہ دکھاتے ہیں لوگ
کہ جنت کو دوزخ بناتے ہیں لوگ
چھنے گا خود اس وقت ظلمت سے نور
کہ مہدی کا جس وقت ہو گا ظہور

وہ کہتے ہیں اب تم قلم توڑ دو
مضامین لکھنا یہیں چھوڑ دو
یہ سر ہیں ہمارے قلم کیجئے
حکایت لہو سے رقم کیجئے

جو بزدل تھے ہم کو ڈرانے لگے
کہ شیروں سے زور آزمانے لگے
جونہی نظریوں میں تصادم ہوا
تو ذہنِ مفکر دہیں سم ہوا

ازل سے لہو کا یہی کھیل ہے
جو ہے پاس اس میں وہی فیل ہے
میں "جاوید نامے" سے پاگل ہوا
بدن میرے افکار کا شل ہوا

لٹی جب بہاروں میں اپنی بہار
گری برق کی طرح دل پر کٹار
وفادار سب بے وفا ہو گئے
مروّت کے رشتے فنا ہو گئے

جو بھائی سے بھائی جدا ہو گئے
تعصّب میں وہ کیا سے کیا ہو گئے

ہوئیں بھائیوں سے جو بہنیں جدا
نظر آ گیا منظرِ کربلا

کروں کیوں نہ ان کا یہاں تذکرہ
سکھایا جنہوں نے مجھے فلسفہ

نہ جانے انہیں مجھ سے شکوہ ہے کیا
سمجھتے ہیں کیوں وہ مجھے بے وفا

ہوا انبیاء میں جو سب سے حسین
وہی ہے نبوت کا ماہِ مُبین
نظر آئے جب سید المرسلین
یقیں ہو گیا اپنا حق الیقین

سرِ بزمِ فاراں جو آواز تھی
وہ تائیدِ یزداں کی غمّاز تھی

نئے دور کا یہ جو احرام ہے
نہ ہے دین اس میں نہ اسلام ہے
مُحبتّ اب اک رسم کا نام ہے
وفا دہر میں حرفِ الزام ہے

دماغ اپنا ہے گو سبو فکر کا
پر ارزاں نہیں کچھ لہو فکر کا

جو بے روح فن ہے وہ بیکار ہے
جہانِ ادب اس سے بیزار ہے
بدن کے بھی خلوت میں آداب ہیں
اگرچہ تمنائیں بے تاب ہیں

جب ایمان اپنا سلامت نہیں
کسی بات پر پھر ملامت نہیں
کبھی سر جو اپنا جھکاتے نہیں
کوئی سرفرازی وہ پاتے نہیں

نظر جس کو اللہ آتا رہا
سرِ دار بھی مسکراتا رہا
بظاہر قلم کار فنکار ہیں
حقیقت میں مکّار و عیّار ہیں

نبوّت کی غایت بتاتے نہیں
نبی کی فضیلت بتاتے نہیں
جو اڑنے لگی ہے سکولوں میں خاک
کیا اس نے دامانِ تعلیم چاک
جو قصہ ہوا آدمیّت کا پاک
کٹی اس سے دنیا میں آدم کی ناک

مسیحا کے نقش قدم پر چلو
زمانے کے مردوں کو زندہ کرو

خیالوں میں ہر آن ہے جو مگن
وہ تنہا ہے اپنے لئے انجمن
اسے کس طرح ہو ملیوں کا ڈر
کہ عرشِ بریں پر ہے جس کی نظر
کمینے ہیں اب منہ کو آئے ہوئے
شریفوں کے سر پر ہیں چھائے ہوئے
نصیحت کا گھر گھر میں اجلاس ہے
برہنہ مگر رقصِ افلاس ہے
قصیدوں کے الفاظ ہیں بے ضمیر
ہیں لوحِ جہاں پر یہ خستہ لکیر
ہوا میت ہر انَا پر ہجوم
پرانی ہیں گو سوگ کی یہ رسوم
لبوں پر شکایت نہ لاؤ کوئی
اناالحق کا نعرہ لگاؤ کوئی
نظر آئیں خنجر رمیدہ جہاں
نگاہوں کو کیجئے خمیدہ وہاں
اگر دل میں اپنے کدورت نہیں
تو اظہار کی پھر ضرورت نہیں
تمہیں دیکھنا ہو جو اپنا مقام
رہو دشمنوں کی نظر میں مدام

طوائف سہاگن ہوئی ہے جہاں
نئی رسمِ الفت چلی ہے وہاں
نظر پر بھی قوت لگاتے رہے
وہ جوبن بھی اپنا دکھاتے رہے

جو فرقوں میں اُمت بٹی ہے یہاں
تو پھر اتحاد و اُخوت کہاں
نظر ہے اگر جنت روح پر
بدن کے جہنم سے کیجئے حذر

چھپو گے تم اس کی نظر سے کہاں
وہ جس پر تمہارا ہے باطن عیاں
میں ہوں اپنے شعلوں سے سہما ہوا
جہنم ہے گو میرا دیکھا ہوا

یہ مانا کہ میں اک گنہگار ہوں
مگر رحمتوں کا سزاوار ہوں
بروں کو گلے سے لگائیں گے وہ
مصیبت کو راحت بنائیں گے وہ

ابوجہل ہے آج اپنا امام
جہالت کو ہم نے دیا ہے مقام
اٹل ہے خدا کا جو قانون ہے
مگر پھر بھی دہر اس کا ممنون ہے

جسے ہم سمجھتے ہیں اپنا کمال
وہ ہوتا ہے دراصل عینِ زوال

ہے کاغذ کی دھرتی پہ لفظوں کا جال
اور اہلِ قلم ہیں اسیرِ خیال

نیا جب بھی آتا ہے دنیا میں سال
تو لاتا ہے ساتھ اک ہجومِ ملال

پریشان ہیں آج فکر و خیال
کہ افسردہ ہے کہکشان جمال

یہ مانا کہ ہر حال ہے حسب حال
نہیں ٹھیک پھر بھی زمانے کی چال

جو زیرِ فلک ہم بلکتے رہے
تو عرشِ معلّٰی کو تکتے رہے

کبھی اشک غم ہم نگلنے لگے
کبھی زہر منہ سے اگلنے لگے

جو ایراں کی دھرتی لہو رنگ تھی
شہنشاہِ ایراں پہ وہ تنگ تھی

منافق ہوں دیں کے اکابر جہاں
وہاں نظمِ اسلام کی ضو کہاں

اب ایران میں ہے خمینیؒ[۱] کا راج
کہ ہیں زیرپا اس کے شاہوں کے تاج

لہو رنگ ایراں کا میدان ہے
کہ ہر شہر ہر قریہ ویران ہے

چلی آ رہی ہے یہ رسمِ کہن
ازل سے ہے انسان وعدہ شکن

خدا نے تو بھیجے ہزاروں رسول
اصول ان کے لیکن ہوئے کم قبول

نگاہِ محمدؐ کے طالب رہو
عمل سے زمانے پہ غالب رہو

یہ صوبہ پرستی نہیں ہے مفید
کہ بہتر ہے دنیا میں دید و شنید

ہمارا جو رب ہے تمہارا ہے رب
کہ ہم تم ہیں آپس کے نام و نسب

زمیں پر جہاں کوئی سرکش ہوا
کمانِ اجل کا وہ ترکش ہوا

اڑائی ہے قانون کی جس نے دھول
کیا ہے خراج اس نے سب سے وصول

۱۔ امام آیت اللہ خمینی، انقلاب اسلامی ایران کے بنیان گزار

عقیدت لٹی ہے مزاروں پہ آج
ہوا قہر نازل سہاروں پہ آج
کیا وقت نے گو اسیرِ الم
رہے پھر بھی حسنین ثابت قدم

کہاں آج ہیں ان سے محسن کہیں
جو احسان کر کے جتاتے نہیں
قلم کی نہ رکھّی کسی نے بھی لاج
ہوئے خوار دنیا میں فنکار آج

جو قاتل تھا لمحوں میں محسن ہوا
نظر میں ہماری وہ مومن ہوا
شرابی کو زاہد بتایا گیا
تو رہزن کو قائد بتایا گیا

ازل کی حقیقت کا ظِل ہو گئی
زمیں پر فقط آب و گِل ہو گئی

مشرق و مغرب کے عظیم فلسفیوں کے حکیمانہ افکار کا ایک عکس

خدا عقل و دانش میں آتا نہیں
کسی چیز میں وہ سماتا نہیں
یہ وہ نشّہ ہے جو اترتا نہیں
جہاں کی فضا میں بکھرتا نہیں

خدا ہی کا مظہر یہ انسان ہے
اسی کی دلیل اور برہان ہے
خودی ہی محبّت کا عنوان ہے
جو اپنائے اس کو وہ ذیشان ہے
بشر کی نظر میں جو عرفان ہے
خدا کی وہ دراصل پہچان ہے
خدا کی وہ عظمت ہے' وہ شان ہے
ہر اک فلسفی اس پہ قربان ہے
ازل سے یہ انسان کا ایمان ہے
خدا ہے تو مخلوق میں جان ہے

یہ انسان ہے مرکزِ کائنات
محبّت کا محور ہے انساں کی ذات

خودی میں نہاں ہیں خدا کی صفات
ثقافت کو ملتی ہے اس سے حیات

خودی ایک انساں کا مقصود ہے
خودی ہے تو انسان محمود ہے
جو منکر خودی کا ہے مردود ہے
حقیقت میں وہ شخص نمرود ہے

یہ انسان تمدّن کی بنیاد ہے
خدا کا جہاں اس سے آباد ہے
خدا بھی اسے دیکھ کر شاد ہے
سبق بھی ازل کا اسے یاد ہے

جو حسن و قباحت کا معیار ہے
وہ پازیبِ عالم کی جھنکار ہے

خدا کا جہاں میں خلیفہ ہوں مَیں
مَلک پڑھ سکیں تو صحیفہ ہوں مَیں

خودی نے دیا ہے غموں کو جنم
اسی کی بدولت ہیں مغموم ہم
خودی سے ہی زندہ ہیں رنج و الم
ہیں رنج و الم بھی اسی کا کرم

خودی کو ملا ہے غموں سے ثبات
ہے رنج و غم ہی خودی کی حیات

ممولے سے جس نے لڑایا تھا باز
کہاں ہے ہمارا وہ دانائے راز
غلط ناز اس کا غلط ہے نیاز
کوئی خود نما ہو جو محو نماز

محقق کی تحقیق بیباک ہے
مگر دیدہ فکر غمناک ہے
سروں پر ادیبوں کے اب خاک ہے
ادب کی ہر اک بزم غم ناک ہے

تصوف کا منصورؒ[1] سلطاں سہی
بجائے خود اکبرؒ[2] کی ہے آ گہی
ملو پہلے عرفیؒ[3] و حافظؒ[4] سے تم
جو ہونا ہے دنیائے بیدل میں گم

1۔ حسین ابن منصور حلاج 244ھ / 857ء میں ایران کے ایک شہر بیضا کے قریب اطور میں پیدا ہوئے جو شیراز کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ وہ ایک مشہور صوفی اور عالم تھے۔

2۔ حضرت محی الدین ابن عربی (شیخ اکبر) اندلس (سپین) میں 560ھ مطابق 1164ء میں پیدا ہوئے اور دمشق میں 648ھ مطابق 1250ء میں وفات پائی۔ وہ وحدۃ الوجود کے انتھک مفسر تھے۔

3۔ جمال الدین محمد بن بدرالدین عرفی شیرازی 963ھ میں پیدا ہوئے اور 999ھ میں وفات پائی۔

4۔ شمس الدین محمد حافظ آٹھویں صدی ہجری کے اوائل 726 کے قریب شیراز میں پیدا ہوا اور 791ھ میں وفات پائی۔

فلاطونؒ[1] کی دنیا میں اعیان ہیں
تو بدھ مت کے نزدیک نروان ہیں

ہر انسان مایا پہ قربان ہے
یہ شنکرؒ[2] کا دنیا میں فرمان ہے

تھا نظریہ شنکرؒ[3] کا یکسر یہی
ہو آباد دنیا مساوات کی

یہی چاہتے شیخِ اکبرؒ[4] بھی تھے
سوال من و تُو نہ باقی رہے

جو فکر و عمل کے یہ عامل ہوئے
تو دونوں حقائق کے حامل ہوئے

جہاں دہر میں تھا انا کا سوال
وہاں شنکر اکبر لگے ہم خیال

جو شنکر نے گیتا کی تعبیر کی
تو اکبر نے قرآں کی تفسیر کی

1۔ افلاطون 7 - 428 ق۔ م میں ایتھنز میں پیدا ہوا۔ وفات 7 - 348 ق۔ م میں پائی۔

2۔ شنکر اچاریہ۔ برہمنی نظریہ وحدت وجود کا حامی اور بھاگوتی مذہب کے توحیدی نظریئے کا نقاد۔

3۔ شنکر اچاریہ ان کا زمانہ 728ء تا 820ء مطابق 172ھ تا 205ھ

4۔ شیخ محی الدین ابن عربی وہ شخص ہیں جنہوں نے وحدت وجود کے نظریئے کو اسلامی تصوف کا ایک لازمی جزو قرار دیا اور ان ہی کی بدولت اسلامی ممالک میں اس نظریئے کا رواج ہوا۔ ان کے نزدیک خدا کائنات ہے اور کائنات خدا ہے۔ ابن عربی کا سن پیدائش 560ھ مطابق 1164ء اور سن وفات 648ھ مطابق 1250ء ہے۔

مگر ایک دونوں کی تعلیم تھی
دیا یوں زمانے کو درس خودی

کِیا اتنی کاوش سے دونوں نے کام
کہ تاریخ عالم میں ہے ان کا نام

یہ پائی گئی بات شنکر میں صاف
ہمیشہ رہے وہ انا کے خلاف

کوئی خود کو جب تک مٹاتا نہیں
خدا کی طرف ذہن جاتا نہیں

مگر اصل میں یہ فنائے خودی
مذاقِ عمل کو فنا کر گئی

جو ذوقِ عمل خود میں رکھتے نہیں
نہیں دہر میں ان کا چرچا کہیں

خدا جو حرم میں دکھائی دیا
وہی تھا کلیسا میں جلوہ نما

بتاتا ہے ہیگل[1] کا یہ فلسفہ
کہ دنیا خدا کا ہے اک آئینہ

1۔ جارج ولیم فریڈرک ہیگل 27 اگست 1775ء کو سٹارٹ میں پیدا ہوا۔ وفات 14 نومبر 1831ء میں پائی۔ ہیگل کے نزدیک عالم مظاہر التباسی یا غیر حقیقی نہیں بلکہ وجود مطلق کا ہی اظہار ہے مظاہر کی حیثیت وہی ہے جو کل کے اجزا کی ہوتی ہے۔

انا اس کے زیرِ اثر ہو گئی
زمیں دل کی زیر و زبر ہو گئی
فرشتوں کو اس کی خبر ہو گئی
خودی اپنی دردِ جگر ہو گئی
مری زندگی یوں بسر ہو گئی
نظر میری ہر چیز پر ہو گئی
ہمہ اوست کی جب سحر ہو گئی
تو ظلمت بھی نورِ نظر ہو گئی

لبوں پر کبھی ہند و یونان تھا
حسینوں کا مرکز بھی ایران تھا
حمیّت اثر ملک افغان تھا
تو یورپ زمانے میں سنسان تھا

زمانے کی بنیاد پانی ہُوا
اگرچہ ہے ہر دور آنی ہُوا
وہ تھلیؔ جو حکمت کا بانی ہُوا
نہ اس کا زمانے میں ثانی ہُوا
ازل میں جو وعدہ زبانی ہُوا
وہ دنیا کی رنگیں کہانی ہُوا

۱۔ تھیلیز ایشیائے کوچک میں ایونیا کے ایک شہر میلیٹس میں پیدا ہوا۔ تھیلیز کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کا عقیدہ ہے کہ "تمام اشیاء پانی ہیں"

خدا ہی زمانے کی تمہید ہے
کہ ہر بات میں اس کی توحید ہے
اسی پر مفکر کی تنقید ہے
ہر اک رنگ میں اس کی تجدید ہے
خدا ہے زمانے میں سب کا رفیق
بہت مہرباں ہے بہت ہی شفیق
اگرچہ مسائل ہیں اس کے دقیق
مگر ہے وہ حکمت کا بحرِ عمیق

خدا ہی زمانے کا منبع رہا
ازل سے ابد تک ہے مرجع رہا
وہ رہتا ہے ہر چیز سے بے نیاز
نہیں راز اس پر زمانے کے راز

مرا جام کثرت سے لبریز ہے
ہر اک چیز اس سے ہی مہمیز ہے
فنا اس میں ہونا ہی مقصود ہے
اسی میں اناؤں کی بہبود ہے

زمانے میں کثرت سے وہ پاک ہے
کہ وحدت کی چاروں طرف دھاک ہے
یہ روح و بدن اس کے محتاج ہیں
یہ سرو و سمن اس کے محتاج ہیں

نہیں کوئی ہرگز خدا کا رقیب
حبیبِ زمانہ ہے اس کا حبیب
کہاں سے میں لاؤں گا ایسے نصیب
کہ پاؤں گا خود کو خدا کے قریب

مراتب میں ہر روح مقبول ہے
مگر مادّیت میں معزول ہے
وہ منطق جو انساں کا معمول ہے
دلائل کی دنیا میں معقول ہے

بدن میں مری روح رِسل ہو گئی
پھر اپنی جگہ منتقل ہو گئی
عناصر کی دنیا میں دل ہو گئی
تضادات پر مشتمل ہو گئی

جو مل جائے جسموں سے ا س کو نجات
تو بن جائے دھرتی کی یہ کائنات
یہی ہے جہاں کا دوام و ثبات
اسی میں ہیں مضمر خدا کی صفات

خدائی نے پایا ہے اس سے ظہور
زمانے میں پھیلا اسی سے فتور
تصوّر کا ہو جائے گا جب شعور
زمانے سے مٹ جائے گا ہر غرور

ہوا اسپنوزا[1] کا ظاہر جنوں
کہ بالذات جوہر ہے رازِ دروں
یہ دنیا خدا سے کہاں ہے جدا
خدا ہی ہے دنیا یہ دنیا خدا

یوں ترکِ عمل گو خطرناک ہے
تناسخ کا دامن مگر چاک ہے
سری کرشن[2] نے اس پہ تنقید کی
ہر اک بات کی اس نے تردید کی
اسی نے روایت کی تجدید کی
اسی نے حقائق کی تجرید کی

اٹھائی سری رام[3] نے جب نقاب
عروسِ معانی نہ تھی بے حجاب

1۔ بارخ اسپنوزا 24 نومبر 1632ء کو ایمسٹرڈم میں پیدا ہوا۔ اس نے 21 فروری 1677ء میں وفات پائی۔ اسپنوزا کے نزدیک "جوہر وہ ہے جو قائم بالذات ہے اور اپنے وجود کے لئے اپنے علاوہ کسی اور شے کا رہین منت نہیں اور جوہر کا تعقل بھی اسی کے ذریعہ ہوتا ہے۔

2۔ کرشن واسدیو جسے مہا بھارت کے قدیم قصوں میں بحیثیت بہادر سپاہی، مذہبی رہنما اور مصلح پیش کیا گیا۔ کرشن کا مذہب خالص توحیدی تھا لیکن عوام نے اس کو خدا بنا ڈالا۔ پھر آہستہ آہستہ وشنو کا اوتار قرار دیا۔ یہ کام بھاگوت یعنی بھاگوتوں نے انجام دیا جو اس کے پیرو تھے۔

3۔ سری رام نوج۔ ہندو فلسفی۔

ملے گی تو نفیِ انا سے نجات
کہ ترکِ عمل ہے نفس پر حیات

ملی اپنشدؒ میں ہمیں ثنویت
یہاں کام آئی کسی کی نہ مت

خدا کے سمندر کا ساحل نہیں
حقیقت میں حق حق ہے باطل نہیں

نبوت، ولایت خدا ہی کی ہے
یہ ہم پر عنایت خدا ہی کی ہے

ابھی فلسفہ ان کو سمجھا نہیں
کہ جامی و رومی کو دیکھا نہیں

وجودی بنا ہے ہمارا لبیدؒ
اسی سلسلے کی کڑی ہے جنیدؒ

سنائیؒ نے دنیا میں ثابت کیا
نہیں ہے حقیقت خدا کے سوا

جو گلزارِ وحدت کی مہکار ہیں
تصوّف میں وہ لوگ شاہکار ہیں
جہاں میں جو شبلی و عطّار ہیں
وہ اپنے زمانے کے فنکار ہیں
خدا جس کو کہتے ہیں واحد ہے وہ
ہر اک چیز کا خود ہی شاہد ہے وہ

ہے حکمت میں ممتاز مامون رشید[1]
تراجم کا شہباز مامون رشید
خلیفہ جو دنیا میں منصور[2] تھا
وہ علم و ادب میں بھی مشہور تھا

نہ کام آیا منکر کے کوئی قیاس
وہ عالم کو سمجھا ہے اک التباس
یہ عالم خدا ہی کی اک نقل ہے
تحیر میں لیکن یہاں عقل ہے

نہیں گو نگاہوں میں کوئی حجاب
ہے چہرے پہ اپنے خودی کی نقاب
کہاں مانا جائے خدا کو مقیم
لہ ہے ہر مقام اس کے دم نے عظیم

۱۔ عہدہ مامون الرشید خلفائے عباسیہ میں ممتاز مقام رکھتا ہے۔ وہ اپنی علم دوستی کی دولت بہت مشہور ہے۔

۲۔ عہدہ ابو جعفر منصور۔ عباسیوں میں یہ بڑا بہادر خلیفہ تھا۔ اس کے علاوہ وہ عالم، فقیہ اور ادیب تھا۔

خدا جس کو کہتا ہے زے نوفیز[1]
اسی کی ہے تخلیق ہر ایک چیز

ہوا یوں عیاں حسنِ رہبانیت
چھپائی ہے اس نے جو حقّانیت

یہ عالم خدا کے قریں خیر ہے
اگرچہ حرم سے الگ دیر ہے

مُجرّد کا عالم بھی معدوم ہے
یہ عالم اگرچہ کہ معلوم ہے

یہ عالم نہیں ہے فریبِ نظر
کہ انسان کا دل خدا کا ہے گھر
ہر اک راہِ وہم و گماں سے گزر
کہ نظمِ یقیں ہو نہ زیر و زبر

ازل میں جو باتیں زبانی ہوئیں
زمیں پر وہ باتیں مکانی ہوئیں

محمّدؐ کے ہاتھوں میں قرآن ہے
زمان و مکاں کی وہ میزان ہے

زمانے میں اوّل ہے آخر ہے وہ
ہر اک شے میں دنیا کی ظاہر ہے وہ

1۔ زنیو نیس: ایلیائی کتب فکر کا بانی ہے۔ وہ تقریباً 576 ق۔م میں آیونیا کے ایک شہر کولوفون میں پیدا ہوا۔ خدا کو زنیو فیس واحد اور ساری کائنات کی اصل سمجھتا ہے۔

ہے صوفی کے لب پر جو ذکرِ خدا
تو جاری ہے ذہنوں میں فکرِ خدا
ہر اک شے پہ دنیا میں قادر ہے وہ
دکھاتا بھی کیا کیا مناظر ہے وہ

ہر اک کی رگِ جاں سے ہے وہ قریب
نہیں کچھ سوالِ امیر و غریب
بسا ہے وہ انساں کے وجدان میں
نہ کیوں شان اس کی ہو انسان میں

زمین و فلک کا خدا نور ہے
اسی کا عیاں جا بجا نور ہے
اسی نور سے ہے جہاں کا وجود
اسی سے ہویدا ہیں غیب و شہود

یہی اک تصوّف کا اسلوب ہے
کہ طالب وہی ہے جو مطلوب ہے
جو خود کو سمجھتے ہیں مجبور لوگ
وہ رکھتے نہیں کوئی منشور لوگ

نہیں ان کے نزدیک کچھ قدریہ[1]
سب اعمال ہوں جس طرح جبریہ[2]

1۔ قدریہ کا یہ عقیدہ تھا کہ انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے کیونکہ اسے متبادل راستوں میں کسی ایک راستے کے انتخاب کا موقع میسر آتا ہے۔ یہ آزادی انسان کو ذمہ دار بنا دیتی ہے۔

2۔ جبریہ کا عقیدہ یہ تھا کہ کائنات کی باقی تمام اشیاء کی مانند انسان بھی تقدیرِ الٰہی کا پابند ہے۔ اسے اپنے فکر و عمل پر قدرت حاصل نہیں۔

خدا سے کبھی اپنے غفلت نہ کر
نفس کے فریبوں سے الفت نہ کر

اسی سے ہر اک شے میں حرکت ہوئی
یہ سب حرفِ کن ہی سے برکت ہوئی

زمانے میں بھارت کے اربابِ فکر
لبوں پر رہا جن کے مکتی کا ذکر

بدن کی فنا پر ملے گی نجات
یہی فلسفہ ہے یہی ہے حیات

نہ وشنو[1] کو گو اپنے رنجش ہوئی
مگر شیو[2] جی کی پرستش ہوئی

منو شاستر[3] میں یہ اظہار ہے
تناسخ عمل ہی کی پرکار ہے

کہ بدھ[4] مت نے عالم کو مانا نہیں
حقیقت کو جینی[5] نے جانا نہیں

1۔ وشنو۔ عالم کا باقی رکھنے والا دیوتا

2۔ شیو جی۔ عالم کو برباد کرنے والا دیوتا

3۔ منوشاستر ہندوؤں کی ایک فلسفیانہ کتاب ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ سزا و جزا کا کوئی دوسرا عالم اس عالم کے سوا ضرور ہے۔

4۔ بدھ مت میں عالم کو نیست مطلق مانا جاتا ہے۔

5۔ جینی فلسفے کا بانی مہا دیر وردمان ہے۔ جینی مذہب میں خدا کا تصور موجود نہیں۔

جو "گیتا" میں جینے کی تدبیر ہے
وہ ترک عمل کی بھی تفسیر ہے
جو ارجن[1] کے ہاتھوں میں تلوار ہے
وہ تلوار بہر خدا کار ہے

جب احساس ذاتوں کا اس کو ہوا
تو شہوک[2] کا یوں رام قاتل بنا
نجاتوں کی ترک عمل جان ہے
یہ بدھا کا دنیا میں نروان ہے

فنا فی اللہ دنیا کا مقصود ہے
خودی کی اسی سے ہی بہبود ہے
جو سیرِ الی اللہ کو سمجھا نہیں
وہ سیرِ فی اللہ سے گزرا نہیں

وہ ہے جامع الجمع افکار کا
نمونہ ہے یزداں کے شہکار کا

1۔ مہا بھارت کے ایک حصہ میں کوروؤں اور پانڈوؤں کی لڑائی کا ذکر ہے جس میں ارجن بھی ایک کردار ہے اور اس کی میدان جنگ میں کرشن بطور اوتار، روحانی طور پر رہبری کرتا ہے۔

2۔ رامائن سے معلوم ہوتا ہے کہ شہوک شودر تھا جو جنگل میں راہبانہ ریاضت کر رہا تھا۔ یہ بات [illegible] کی خلاف ورزی تھی۔ شودر ریاضت نہیں کرسکتا۔ صرف اعلیٰ ذات کے لوگ کرسکتے ہیں۔ رام نے شہوک کی ریاضت کی وجہ سے اسے قتل کردیا۔

جہاں عبد و معبود کا اُنس ہے
وہاں روح کی منزلِ قُدس ہے
نہ کام آ سکیں گی کبھی شش جہات
بنے گی تو یکجہتی سے اپنی بات

خدا کی غلامی میں حاضر رہو
زماں و مکاں کے بھی ناظر رہو
زمیں آسماں کی مسافت کرو
جھکا کر سروں کو خلافت کرو

نہ ہوں گی کوئی سامنے جب قیود
تو جاری رہے گا ترا پھر وُجود
مشائخ ہدایت پہ مامور ہیں
مگر واصلینِ خدا دور ہیں

جو راہِ خودی پر ہوا گامزن
وہ ٹھہرا ہے دنیا میں باطل شکن
رسولِؐ خدا جب مُعلّم ہوئے
تو دینی مکاتیب قائم ہوئے

مرے سامنے ہے "زبورِ عجم"
اسے پڑھ کے جاتے رہے میرے غم
نہ ترکِ خودی سے ملا ہے خدا
بدن ہے جدا اور سایہ جدا

ترا راز مجھ پہ عیاں ہو گیا
حقائق کا میں ترجماں ہو گیا
نہ مدغم ہوا میں ترے نور میں
نہ دل ہی مبدل ہوا طور میں
جو آنکھوں سے دیکھا جمال احد
شہود اپنا یکسر ہوا مستو
بقا سے ملا ہے ہمیں یہ کمال
کہ دیکھا ہے حق کو بنظر جمال
جو مانع نہیں ہے کوئی اب خیال
تو جاتا رہا ہے اسی سے زوال
زمانے میں جو جزُ سے کلُ تک گیا
وہی کلُ سے جزُ تک ہے سمٹا ہوا
محمدؐ ہی نبیوں کے سالار ہیں
کہ جامع تمام ان کے افکار ہیں
جو سالک نے کثرت کو وحدت کیا
کبھی ہوش کو اس نے وحشت کیا
کوئی چیز جب اعتباری ہوئی
نظر دیکھنے سے بھی عاری ہوئی
نہ تھا کوئی سردارِ اہلِ فراق
اترتا کوئی جس کی خاطر براق

نہ ہو گر کوئی خواجۂ اہلِ غم
تو محسوس ہو گی خوشی بھی الم

خدا کی کمالات ہیں گو عیاں
خدا ہے نگاہوں سے پھر بھی نہاں

جو وحدت کے دریا میں گم ہو گیا
محمدؐ کی مجلس میں وہ ضم ہوا

وہ جس کی نگاہوں میں کل غیر ہے
حقیقت میں اس کا حرم دیر ہے

جو سالک نے کثرت میں دیکھا خدا
تو وحدت میں کثرت نہ دیکھی جدا

جو اخلاق میں اپنے کامل ہوا
صفِ اولیں میں وہ شامل ہوا

جو اول اور آخر میں ٹھہرا خدا
وہی ایک بانی ہے کونین کا

خدا نور ہے دہر قندیل ہے
مُسلّم جہاں میں یہ تاویل ہے

خدا کیا ہے اس پر نظر ڈالئے
نظر پر مُکرّر نظر ڈالئے

سرِ لا مکاں ہے مری ذات میں
جہاں کا جہاں ہے مری بات میں

مرے دم سے مٹی میں پرواز ہے
خدا کی زمیں پر یہ آواز ہے
جہاں خود فروشی کا بازار ہے
زمانہ خود اپنا خریدار ہے

نہ ہو منتظر کیسے اس کا ایاز
کہ محمود ہے ارمغانِ حجاز
جو "جاوید نامہ" ہے روشن کتاب
اٹھا ہے اسی سے دوں کا حجاب

نہ پایا کسی کو بھی اپنا ندیم
ہوئی ترجماں دل کی "ضربِ کلیم"
اگر حق سمجھتے ہو ناسوت کو
کرو دفن مایا کے تابوت کو

تجلّی جو آنکھوں میں مستور ہے
عیاں اس سے اللہ کا نور ہے
جہاں میں ہے اک وہ محمدؐ کی ذات
کہ ملتی ہیں جس میں خدا کی صفات

خدائی میں جو فرد کامل ہوا
خودی کا وہی شخص حامل ہوا
نظر میں جو صوفی کے لاہوت ہے
وہ ہیروں میں ہیرا ہے یاقوت ہے

نظر میں جو نورالسموات ہے
خدائے مقدس کی وہ ذات ہے
ہمیں جس کا دیدار مطلوب ہے
اسی کو یہ دنیا بھی مرغوب ہے

نہیں جس کو دنیا ہماری عزیز
بنے گی کہاں اس کی عقبیٰ کنیز
خودی کے نئے باب کھولے گئے
ہم اس کی ترازو میں تولے گئے

یہ مخلوق سے اس کی ثابت ہوا
کہ ہر چیز سے ہے مقدم خدا
اسے ڈنس[1] سمجھا تھا اک "فردیت"
کہ ولیم[2] نے دی تھی جسے اہمیت

انا کی نفس میں جو اقلیم تھی
تو ڈیکارٹ کو بھی وہ تسلیم تھی
سپونوزا تھا وہ جس نے بخشی صلیب
مسیحا کا ٹھہرا وہ اعلیٰ خطیب

خدا بھی تھا عیسیٰ اور انسان بھی
بنائی یہ توحید تثلیث کی

1۔ ڈنس اسکاٹس (متوفی 1308ء)

2۔ ولیم آف اکہم (متوفی 1350ء)

خدا تو بجائے خود اک فرد ہے
یہاں فکر انسان کی گرو ہے
عجب ہے یہ تیرا بھی کلام
کہ دنیا مری وحدتوں کا ہے نام

جو انسانیت سے بنی زندگی
وہی زندگی پھر انا ہو گئی
خودی ہی وجودوں کی بنیاد ہے
ہر اک کو خودی کا سبق یاد ہے

خودی سے ہے ظاہرؔ ہمارا وجود
خودی توڑ دیتی ہے ساری قیود
خودی سے خدائی کو بیدار کر
خودی کا زمانے میں پرچار کر

جہاں سینکڑوں اس میں پوشیدہ ہیں
جو حامل ہیں اس کے وہ فہمیدہ ہیں
ثباتِ خودی سے جو اب غیر ہے
خدا ہے وہ اپنا، خودی خیر ہے
زمانے کو اس سے اگر بیر ہے
خودی کی ترے سامنے سیر ہے

خودی آج اس کو ہی مطلوب ہے
جو خواہش سے دنیا میں مغلوب ہے

خودی سے زمانے کی تکمیل ہے
اسی کی زمانے میں تذلیل ہے
شراروں میں شعلوں کو تقسیم کر
تُو اس بات کی عام تعلیم کر

جہاں جُز پرستی ہے اپنی انا
وہاں کُل پرستی بنی ہے خدا
خودی کو بھی اجزاء میں تحلیل کر
تو وحشت سے صحرا کی تکمیل کر

جو اپنی انا سے خبردار ہے
وہ ذرّہ حقیقت میں کہسار ہے
خودی کو نمائش کی عادت ہوئی
وہ خوابیدہ ذرّوں میں آیت ہوئی

یہ عالم ہے دیکھو خودی کا ظہور
ہے ذرّوں میں رقصاں اسی کا شعور
بنی سازِ افکار اپنی انا
اسی کا فضاؤں میں نغمہ سنا

وہ کون و مکاں کی بھی مالک بنی
خودی جب کبھی اپنی سالک بنی
حقیقت ہی دنیا میں ہے لازوال
وہ ہے لا مکاں اور ہے باکمال

خودی بھی خودی میں سماتی نہیں
کہ رُتبہ خدا کا وہ پاتی نہیں
جدائی ہے الفت کی آئینہ دار
جدائی ہے عاشق کو بھی سازگار

محبّت ہی دنیا میں ہے دیدہ ور
کہ محفل میں اپنی ہے وہ خود نگر
میں دنیا کے سینے میں اسرار ہوں
مگر اپنی ہیئت کا اظہار ہوں

انا جب خدائی کی زینت بنی
تو جینے کی دنیا میں صورت بنی
جو پہچان کر خود کو خود رُک گیا
تو اپنے ہی قدموں پہ وہ جُھک گیا

مَن و تُو ہو کیا جان و تن سے جدا
خدا بھی نہیں میرے من سے جدا
نگاہوں میں جب ملک و دیں ایک ہیں
مرے آسماں و زمیں ایک ہیں

کبھی ذات سے اپنی غافل نہ ہو
خدا کی نگاہوں میں جاہل نہ ہو
ترے سر پہ خدمت کا گر تاج ہے
فرشتوں میں اس سے ترا راج ہے

جب آدم کی جلوہ نمائی ہوئی
زمیں پر خدا کی خدائی ہوئی
ولی جو خدا کا مُقرّب ہوا
وہ کونین میں عالی منصب ہوا

دوئی دور کرنا ولایت میں ہے
تو مِعراج خدمت نبوت میں ہے
کوئی ابتدا جب ادب ہو گئی
تو خدمت گزاری طلب ہو گئی

خودی جب بھی قبلہ نما ہو گئی
وہ ہستی میں اپنی خدا ہو گئی
زمانے کا مقصد ہے دیدارِ ذات
نگاہوں میں ہے جلوۂ شش جہات

جو ٹھہرے زمانے میں اب مظہری
نہ حاصل ہوئی ان کو کچھ برتری
نہ درویش کا فقر سنجیدہ ہے
نہ اللہ کا راز پیچیدہ ہے

مُحبّت کے معنی اطاعت ہوئے
تو خدمت کے معنی نیابت ہوئے
اگرچہ یہ انسان سنجیدہ ہے
خدا کا مگر راز پیچیدہ ہے

نگاہوں میں جن کی ہیں حور و غلام
میسّر نہیں ان کو سیرِ دوام

جو ملا کی خواہش ہے رقص و سرور
تو عاشق کی جنت ہے اس کا وجود

نفس کی اطاعت میں بصری نہیں
مقابل میں کوئی بھی عصری نہیں

زمیں پر خدا کی نیابت کرو
تو بندوں پہ اس کے عنایت کرو
جو حاصل ہے اس پر قناعت کرو
تو نیکی کی سب کو ہدایت کرو
خدا کی جہاں میں عبادت کرو
زمیں آسماں کی صدارت کرو
رسولِ خدا کی اطاعت کرو
غریبوں، یتیموں کی خدمت کرو

لہو سے لکھوں گا تری منقبت
کہ ہو جائے گی جب تری معرفت
ہے ذکرِ خدا میں مری عافیت
سنورتی چلی جائے گی عاقبت
نظر مجھ کو آتی نہیں آخرت
اسی میں سمجھتا ہوں میں خیریت

زمانے میں جو چیز مشہود ہے
تو اس کا سمجھنا ہی بے سود ہے

گھری نور و ظلمت میں یہ کائنات
کہ اصلی و ظلّی ہیں اس کی صفات
کریں لاکھ تقسیم ہم اس کی ذات
مگر ہے یہ از قسم نا ممکنات

ملی ہم کو یہ جانِ جاناں[1] سے بات
جو تھے با یقیں شیخ اعلیٰ صفات

جو یہ فکر مرزا میں دیکھی ضیا
کہا شاہ ولی اللہ[2] نے مرحبا

حقیقت میں ہیں ایک ذات و وجود
اسی سے ہے دنیا میں سب کی نمود

وجودیّت اک سوچ کا زینہ ہے
یہ کثرت میں وحدت کا آئینہ ہے

وجود خدا ہے فقط عینِ ذات
نگاہِ تصوّف میں دن ہے نہ رات

جو بے رنگ چیزیں ہیں رنگین ہیں
مسائل تصوّف کے سنگین ہیں

1۔ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں دہلویؒ وفات 1192ء

2۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ 1702ء تا 1762ء

مسائل میں جب مجھ سے لغزش ہوئی
خدا کے یہاں میری پرسش ہوئی

جہاں باقی باللہ تھے گرم سفر
وہیں تھے فنا فی اللہ بھی جلوہ گر

جو چلتا نہیں کام تقلید سے
تو بچنا بھی مشکل ہے تقلید سے

جو اب بھی دلیلوں کا محتاج ہے
حقائق کی دنیا میں تاراج ہے

جو اصغر[۱۰] کا ہاتھوں میں دیوان ہے
ادب کے وہ سینے میں طوفان ہے

ہوا اپنے افکار میں جو شہید
نہیں ہے کسی پیر کا وہ مرید

جو بے شکل با شکل عالم ہوا
تو موہوم ایمانِ آدم ہوا

وہ ذات احد ہے اگرچہ عیاں
ہیولا ہے صورت میں اس کا نہاں

خدا ہی حقیقت میں معبود ہے
اسی سے خدائی کی بہبود ہے

۱۰۔ حضرت مولانا سید امجد علی شاہ اصغر اکبر آبادی وفات 1230ھ مطابق 1814ء

عبادت خدا ہی کی مقصود ہے
جو منکر ہے اس کا وہ نمرود ہے

جو اپنے خدا سے جہاں غیر ہے
تو توحید اس کی فقط خیر ہے

نگاہِ جہاں سے جو معدوم ہے
حقیقت خدا کو وہ معلوم ہے

مُجدّد کے اپنے کمالات ہیں
جو حاصل انہیں یہ مقامات ہیں

ہوئے جس پہ قابض یہ مستشرقین
وہ تھی اپنے علم و ادب کی زمین

وہ صوفی نہیں اپنا ویدانتی
جو دنیا خودی کو نہیں مانتی
اگر یہ خودی کو نہیں جانتی
نہیں ہے زمانے میں پھر شانتی

وہی شخص دنیا میں پرکاش[1] ہے
جو اپنے تدبّر کا آکاش ہے

جہاں عزم و ہمت کا ہے اتّصال
وہاں نور و ظلمت کا ہوگا وصال

---

[1] [illegible] کے مطابق

یہ مانی[1] کا ہے فلسفے میں خیال
نظر سے ہے اوجھل خدا کا جمال

یہ ایرانیوں کے عقائد ہوئے
وہ ذہنوں کی دنیا میں قائد ہوئے

خدا ہی کا سایہ ہے یہ آفتاب
کہ سائے نے کھولے ہیں سائے کے باب

خدا کی جو ہستی کے ہیں دو مقام
مجدد نے بخشے ہیں ان کو یہ نام

زمانے میں کوئی نہ تھا سارتر[2]
کہ ہاتھوں میں رہتا تھا جب شاستر

یہی فلسفہ دیکھو گیتا میں ہے
یہی گفتگو اب کویتا میں ہے

نظر میں ہیں میری عراق و عرب
کہ صوفی کو جن سے ملا ہے ادب

عراق و عرب سے تصوف ملا
تو ایراں سے ہم کو تکلف ملا

---

1. مانی۔ پیدائش 215ء یہ ایرانی فلسفی ہے جس کا نظریہ ہے کہ [illegible] نور و ظلمت کی ازلی قوتوں کے اتصال سے ظہور میں آئی ہے جو ایک دوسرے سے [illegible] ہیں۔ ظلمت میں [illegible] ہے شر کے عناصر پوشیدہ تھے۔
2. جین پال سارتر 1905ء میں پیدا ہوا۔ یہ [illegible]

دلستانِ مذہب نہ دیکھو ابھی
کہ روح و بدن کو نہ پرکھو ابھی

جو مخلوقِ اول یہاں عقل ہے
یہ دنیا خدا کی ہی اک نقل ہے

کیومرثؑ[1] تھا اک بڑا نامور
طہورثؑ[2] ہوا اس کا پیغامبر

فریدونؑ[3] و جمشیدؑ[4] ٹھہرے نبی
منوچہرؑ[5] و خسروؑ[6] بھی ٹھہرے ولی

وہ زرتشتؑ[7] تھا جو بڑا فلسفی
نہاں اس کی دنیا پہ ہے آگہی

ہے اعمال میں جس کے رُوحانیت
بیاں میں نہیں اس کے شیطانیت

1۔ ایرانیوں کا پہلا پیغمبر کیومرث ہے۔

2۔ طہورث

نوٹ یہ نمبر 2 سے لے کر 6 تک کے تمام افراد ایرانیوں کے پہلے پیغمبر کیومرث کی اولاد میں سے ہیں اور ان میں زرتشت بھی شامل ہے۔ یہ سب پیغمبر مانے گئے ہیں

3۔ فریدوں

4۔ جمشید

5۔ منوچہر

6۔ کے خسرو

7۔ زرتشت پہلا ایرانی پیغمبر ہے جس نے ثنویت کو وحدت میں تبدیل کرنے کی کوشش کی۔

اسے مل گئی آسمانی زباں
جو رُوحانیت میں تھا اپنی جواں

یہ وحدت ہی دنیا کی بنیاد ہے
خدا کا جہاں اس سے آباد ہے

نہ کام آئے اپنے وہ تخمین و ظن
کہ یزداں جہاں تھا وہیں اہرمن

مُحبّت کے باعث ہے جلوہ گری
کہ رقصاں ہے شیشے کے اندر پری

عروسِ میں معانی ہے صورت میں بند
ہے اظہار اس کا بھی مانندِ قند

حقیقت نے چہرے پہ ڈالی نقاب
وہ رکھتی ہے ظاہر میں اپنا حجاب

جو فکر و نظر میں مُوحّد بھی ہے
نئے فلسفے کا وہ موجد بھی ہے

جو ٹھرا ہے کردار میں ثنویہ
مقولے تمام اس کے ہیں رمزیہ

نہ کام آئی مانی کی ام الحیات[۱۰]
نہ اتری کوئی آسماں سے برات

---

۱۰ ایرانی فلسفی مانی کے مطابق تاریکی کی قوتوں کو تباہ کرنے اور ان پر فتح پانے کے لئے خدا نے ایک دیوی کو اپنے سے صادر کیا جس کا نام "ام الحیات" ہے۔

کہ تثلیث جس کا عقیدہ رہا
وہ راہوں پہ اپنی نہ سیدھا رہا

خیالوں میں جن کے اساطیر تھے
وہ فکر و نظر کے مہابیر تھے

یہ مانی[1] نے مینوک[2] کو خط لکھا
تمیزِ عناصر بھی سب کو سکھا

جو اپنے بیانوں میں بُرّاق تھا
مراتب میں وہ نفس کے طاق تھا

صلیبِ وفا پر جو مصلوب تھا
وہ دستِ اجل سے نہ مغلوب تھا

جو رسوا سرِ دار منصور تھا
یہ ظلمت کا ہاتھوں میں دستور تھا

خدا نفس کو جب منوّر کرے
زمانے میں وہ ہم کو سَرور کرے

جو نورِ خدا سے قمر ہوگیا
وہ باغِ عدن کا ثمر ہوگیا

1۔ مانی 215ء میں پیدا ہوا۔ یہ ایرانی فلسفی ہے۔

2۔ مانی کے مطابق انسان کی نجات اس پر موقوف تھی کہ وہ اپنی فطرت کے مختلف عناصر میں امتیاز کرنا سیکھے۔ اس لئے اس امر کی تعلیم انسان کے لئے اہم ہے اس مقصد کے پیش نظر مانی کنواری مینوک کو ایک خط میں اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ وہ عناصر میں امتیاز کرنا سیکھے۔

ہے دل میں نہاں شیطنت کا ضمیر
اٹھا ہے اسی سے زمیں کا خمیر

جو نظریوں کا ہادی[1] بانی نہیں
نئی فکر میں اس کا ثانی نہیں

یہ نکتہ تھا مانی کے فرمان میں
ظہور خدا ہے تو انسان میں

جو ایران میں قرۃ العین[2] تھی
عقائد میں اپنے وہ بے چین تھی

بتاتی ہے دنیا کو اس کی صفات
کہ جوہر سے ہوتی ہے توسیع ذات

ملا حاجی کاظم[3] کو جو واسطہ
حقیقت میں وہ شیخ احمد[4] ہی تھا

اتارا جو اس نے لباسِ مجاز
بنا مہدی موعود با فخر و ناز

1۔ ملا ہادی (اٹھارہویں صدی عیسوی) بہاء اللہ کا پیش رو۔ اس کی تصنیف "[illegible]" ہے جس نے فلاطونیت اور تصوف سے اپنے نظریات کو مرتب کیا۔

2۔ قرۃ العین مشہور حسین ایرانی شاعرہ علی محمد باب ثالث کی پیرو تھی۔

3۔ حاجی کاظم جو خود کو امام مہدی اور عوام کے درمیان ایک واسطہ سمجھتا تھا۔

4۔ شیخ احمد وہ شخص تھا جس نے سب سے پہلے امام اور عوام کے درمیان ایک واسطہ ہونے کا دعویٰ کیا۔

بہا اس کا ہی جانشیں ہو گیا
دلوں میں وہ پھر جاگزیں ہو گیا

سماوی کتابوں سے سب کچھ لیا
بہا نے ہی اپنے کو مہدی کیا

کیا جب سے عیسیٰ میں رب نے حلول
نہیں ہے کلیسا میں کوئی ملول
بنایا جو انسانیت کو اصول
تو ٹھہرا مساوات کا وہ رسول

فلاطون جو دنیا میں راہب ہوا
وہ اعیان حکمت میں صائب ہوا

ہیں جتنے علوم جدید و قدیم
یقیناً فلاطون تھا سب کا علیم

حقیقت شناسا نہیں ہیں حواس
ذریعہ اگر ہیں تو علم و قیاس

نہاں ہے نگاہوں سے راز حیات
ہے کیا کوئی امتیاز حیات

مصائب میں جینا بھی اب موت ہے
یہ دنیا کے گنبد کی اک صوت ہے

اجل میں نہاں ہے جو رازِ حیات
وہ دنیا میں ٹھہری قیامت کی بات

وہ روح و بدن کے بھی ثالث ہوئے
جو لیے مصائب کا باعث ہوئے

جو ارمان جینے کا مردہ ہوا
ہر اک فرد اس سے فسردہ ہوا

اجالے سے اپنے جو مایوس ہے
وہ فانوس بے نور فانوس ہے

نہ حکمت میں اب کوئی جاذوس[1] ہے
نہ افکار سے کوئی مانوس ہے

فلاطوں جو دنیا میں سادھو ہوا
عیاں اس کی حکمت کا جادو ہوا

سکھایا ہے جینے سے جس نے گریز
وہ کرتا ہے احساسِ دل سے گریز

فلاطوں جو اپنا مُفکّر ہوا
وہ موجود ہونے سے منکر ہوا

بدن پر ہے آدم کا جس کے لباس
قبول اس کا ہے صوفیوں میں قیاس

---

[1] جاذوس - فلسفی و حکیم

ہر اک حکم اس کا جو محکم ہوا
نظر میں وہ لوگوں کی آدم ہوا

جو ذوقِ عمل سے بھی محروم تھا
بدن اس کا دھرتی پہ معدوم تھا

نہ عالم نظر میں تھا اسباب کا
نہ منظر رہا وہ کسی خواب کا

یہ امکاں کا عالم جو موجود ہے
نظر میں فلاطوں کی بے سود ہے

نہیں کوئی موجود معدوم میں
ہے مخفی ہر اک چیز معلوم میں

نہیں قائم اک حال پر کوئی شے
یہ ہے ہر قلیطس[1] نے کی بات طے

تغیّر ہر اک شے میں جاری رہا
مگر فلسفی اس سے عاری رہا

کسی کو نہیں خیر و شر سے نجات
اسی سے ہے جاری یہاں پر حیات

جو محسوس اشیا بدلتی رہیں
تو باطن میں اپنے وہ جلتی رہیں

---

[1] ہر اقلیطس افیساس ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوا بقول دیو جانس وہ 504 ق۔ م میں پیدا ہوا۔ وہ حرکت اور تغیر کو کائنات کی بنیادی خصوصیت تصور کرتا ہے۔

فراست کی جو چیز معروض ہے
وہ اعیانِ ثابت کی مقروض ہے

زمانے کا جس کو بھی ادراک ہے
وہ کشفِ حقائق میں بیباک ہے

اسے علم یوں خیر و شر کا ہوا
کہ ہاتف تھا سقراط[1] کا رہنما

جہاں دیر و کعبہ مماثل ہوئے
وہاں ہم کو طوفاں بھی ساحل ہوئے

ہُوا رقصِ صوفی سے باطن عیاں
کہ شکلِ فلاطوں تھی اس میں نہاں

یہ دنیا خدا ہی کی اک نقل ہے
یہ اظہار کی اس کے اک شکل ہے

حقائق میں جو رہنما عقل ہے
وہ ہر چیز کی مرکزِ ثقل ہے

جو ٹھہری نگاہوں میں ام الکتاب
ضمیروں کی دنیا میں ہے بے حجاب

نظر میں ہے عریاں جو اب عینِ ذات
زباں پر ہیں رقصاں اسی کی صفات

---

1. سقراط 469 ق۔م میں ایتھنز میں پیدا ہوا۔ اس کی وفات 399 ق۔م میں ہوئی۔ بقول سقراط اس کا محافظ فرشتہ سلبی احکام صادر کرتا تھا۔ برے کاموں سے منع کرتا، اچھے کام کے وقت خاموش رہتا تھا۔

عدم ہے اک آئینۂ ہست و بود
فنا میں نہاں ہے بقا کی نمود
خدا کو جو پا کر کہیں کھو گیا
وہ عالم زمیں پر عدم ہوگیا
ترا قول جب کوئی باطل ہوا
خدا کی نظر میں تو قاتل ہوا
زمیں پر ہے جنّت جو غارِ حرا
یہ رتبہ اسے مصطفیٰؐ سے ملا
خودی کا جہاں میں جو دیوانہ ہے
وہ دیوانگی ساز فرزانہ ہے
جو درد آشنا بے خبر ہوگیا
جہنّم سے وہ بے خطر ہوگیا
جو صحرا میں وحشت بڑی چیز ہے
پہاڑوں کی خلوت بڑی چیز ہے
تری روح ہے گرچہ نورِ حیات
میسّر نہیں تجھ کو پھر بھی ثبات
نہیں روح محتاج اب جسم کی
کسے تب ضرورت یہاں اسم کی
خدا کا ہے ذہنوں میں رقصاں خیال
اگرچہ رسائی ہے اس تک محال

یہ دنیا جو فرقوں میں تقسیم ہے
اسے ترکِ دنیا کی تعلیم ہے

ملا ترکِ دنیا سے ہم کو خدا
نہیں ہے خودی سے خدا بھی جدا

خدا بھی انا سے عبارت ہوا
جو مطلق نظر میں صداقت ہوا

من و تو کی عارض ہے ذاتِ قدیم
خدا ہے جو مشکل میں اپنا ندیم

اگرچہ من و تو میں پیکار ہے
خودی ان کے مابین دیوار ہے

جو محمود[۱] اپنا مُوَحّد ہُوا
وہ فکر و نظر کا بھی موجد ہُوا

تن و جاں جدا ہیں برائے کلام
جدا ان کو کہنا مگر ہے حرام

تری جان میں رقصاں ہے کُل کائنات
رگوں میں ہے جاری اسی سے حیات

بہر سمت ہے رقص فرما خدا
وہی ابتدا ہے وہی انتہا

۱۔ شیخ سعید الدین محمود بن عبدالکریم شبستری قصبہ شبستری میں جو تبریز سے سات میل پر واقع ہے پیدا ہوئے۔

خدا سے جو انسان غافل ہوا
وہ فرزند و زن کا بھی قاتل ہوا

زر و مال کے ہم جو خواہاں نہ ہوں
سلیمان ہم سے گریزاں نہ ہوں

جو کافر کی خلوت ہے صحرا و دشت
تو مومن کی دنیا ہے روزِ الست

جو پاتا ہے ترکِ بدن سے خدا
خودی اس کی رہتی ہے اس سے جدا

جو دریا میں موجوں کی کثرت ہوئی
وہ باطن کی دنیا میں وحدت ہوئی

نہ احساس بن جائے دل کا حجاب
ترے ہاتھ میں ہے بدن کی کتاب

دکھائی دیا گرچہ ہر ذرّہ چاند
مگر چاندنی کچھ نظر آتی ہے ماند

زمانے میں جو اشتراکی ہوا
نظر میں وہ صوفی کے خاکی ہوا

جہاں دل کا تسخیر ہو کر رہا
کہ تارِ نظر تیر ہو کر رہا

جو مومن بتاتا ہے خود کو فقیر
وہ ہوتا ہے کون و مکاں کا امیر

مُحبّت ہمیں آب و گل سے رہی
تو روحِ عقیدت بھی دل سے رہی

جو آدم کو توقیر اس سے ملی
کلی اس سے دل کی ہمارے کھلی

نہ بے عزم جینے کی تلقین کر
تو اپنے پسینے کو نمکین کر

لہو سے کہانی کو رنگین کر
کسی کو عمل سے نہ غمگین کر

جہاں فقر کافر ہے خلوت پسند
وہاں فقر مومن ہے جلوت پسند

تصوّف سے تھا ابنِ جوزیؒ[1] پرے
شکار اس نے روحوں کے آہو کئے

نہ کچھ تیمیہؒ[2] کا بیاں گرم تھا
نہ تھا آدمی وہ شرارت نما

1۔ علامہ ابن جوزی تصوف اور روحانیت کی مخالفت میں بڑے جری اور نامور ہیں در حقیقت تصوف ان کا موضوع نہیں ہے۔

2۔ شیخ السلام علامہ تقی الدین ابوالعباس احمد بن تیمیہ دس ربیع الاول 661ھ کو بہ مقام حران میں پیدا ہوئے۔ ابن تیمیہ بھی تصوف اور روحانیت کی مخالفت میں جری تھی۔ یہ موضوع ان کا نہ تھا لیکن اس کے باوجود وہ نیک نیت تھے۔

یہاں ہالڈن[1] کو ہے یہ اعتراف
نہیں کُل سے جُز کو کوئی اختلاف
حقیقت کا ہے غیر ممکن شہود
کہیں ہے عدم تو کہیں ہے وجود

نگاہِ بشر میں اسی کا ہے نور
ملا جس سے جامیؒ[2] کو فکر و شعور
یہ کیا اور کیوں ہیں کچھ ایسے سوال
کہ جن کا جواب اصل میں ہے محال

مظاہر سے ہم کو ہوا تجربہ
کہ ممکن نہیں فکر کا تجزیہ
یہی آرتھر[3] نے بتایا ہمیں
جو دیکھا تھا اس نے دکھایا ہمیں

تھے ولیم[4] کی دانست میں ایک ہی
نبی اور دنیا کے عام آدمی

1۔ پروفیسر ہالڈین' انتہائی حقیقت جس میں باقی تمام چیزیں تو تحویل ہو سکتی ہیں لیکن وہ خود اپنے سوا کسی چیز میں تحویل نہیں ہو سکتی۔

2۔ نورالدین عبدالرحمٰن جامی 817ھ میں پیدا ہوئے۔

3۔ جے۔ آرتھر ٹامسن۔ سائنس الفقات تجربہ کا سادہ الفاظ میں مدلل و متوافق بیان ہے۔

4۔ ولیم جیمس Variety of Religious Experience مذہبی واردات کا تنوع۔

یہ ولیم تھا اک ماہرِ نفسیات
تصوّف کی سمجھا مگر وہ نہ بات

رہی شیخ سینا[1] کو جس کی تلاش
کبھی ان کو جلوہ دکھاتا وہ کاش

دیا پالسن[2] نے جو حکمت کا جام
چلا اہلِ دانش کا دنیا میں کام

ہیوم[3] کو ملا ہے اسی سے قرار
مظاہر پہ حکمت کا ٹھہرا مدار

"بواطن" تھا اک فلسفہ کانٹ[4] کا
جو پیش اس نے دانشوروں کو کیا

میسر کسے ہے یہاں علم غیب
یہ دنیا ہنر میں بھی رکھتی ہے عیب

1۔ شیخ الرئیس ابو علی الحسین ابن عبداللہ ابن سینا 980ء میں بخارا کے قریب ایک گاؤں افشنہ میں پیدا ہوا اور 1037ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔

2۔ پالسن۔ اس کے مطابق فلسفہ کوئی سربستہ نظریہ نہیں بلکہ ایک عمل طلب مسئلہ ہے۔

3۔ ہیوم۔ اس نے فلسفہ جدید میں یہ واضح کیا کہ انسان کا سارا علم مظاہر کی حدود میں ہے کیونکہ اس کا دار "ارتسامات" یا ان کی نقل "تصورات" پر ہے۔ ارتیابیت کا آخری حامی اور ایک مشہور معتبر ہیوم تھا (1711ء تا 1776ء)

4۔ امانول کانٹ 22 اپریل 1724 میں پیدا ہوا اور 1854ء میں انتقال ہوا۔ "بواطن" حقائق اشیاء کو کانٹ کی اصطلاح میں بواطن کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

رہے اس کے جو بندہ اقبال و میر
اسی سے اٹھا ہے ہمارا خمیر

جو حافظ کو آیا نظر آئینہ
وہ دیتا ہے حق کی خبر آئینہ

دکھائی دیا خوب رابرٹ کو خواب
کہ دنیا ہے بس ایک کہنہ کتاب

نہ سرمد کو دنیا سے لو تھی کوئی
اسے سیم و زر کی ضرورت نہ تھی

ایپقوریئے تھے جو یونان میں
تھا انساں سے انس ان کے ایمان میں

رواقی نے مقصد معین کیا
ہر اک قدر کی روح کو تن کیا

[illegible]

اگرچہ خدا سے وہ بیزار تھا
تو لکری شیس[1] ایک فنکار تھا

رموز ازل کس کو معلوم ہیں
ہمارے یہ دنیا میں مقسوم ہیں

کوئی رازِ فطرت بتاتا نہیں
حقیقت سے پردا اٹھاتا نہیں

یہ نکتہ نہ تھا ذہنِ خیام[2] میں
کہ گردش یہ کیسی ہے ایام میں

ملے گی زمانے کو کیسے نجات
بتائی ہے ڈانٹے[3] نے ہم کو یہ بات

خدا کی خدائی کا اقرار کر
اس اقرار کا دل سے اظہار کر

1۔ روما کا مشہور شاعر لکری شیس فلسفی تھا اور ایپیقوریت کا شیدائی تھا۔

2۔ خیام فلسفہ، نجوم، فقہ، ادب، تاریخ اور [illegible]
سال پیدائش مشکوک ہے۔

3۔ ڈانٹے بہت بڑا قدیم شاعر ہے [illegible] Divine Comedy [illegible]
[illegible] ابتدا اور اس کے علاج سے آگاہ کرتا ہے۔

جو گیٹے[1] نے جیون کی تفسیر کی
وہ اک زندہ رہنے کی تدبیر تھی
وہ جب تجربے کی طرف آئے گا
مصائب سے انسان بچ جائے گا

ہوا فلسفے سے یہی انکشاف
کہ آئینہ قدرتِ حق ہے صاف
کیا اچی لس[2] نے جو پیدا شعور
وہ تھا ایک انسانیت کا شعور

جہاں سینٹیانا[3] دکھائی دیا
تھا مذہب کے دریا میں ڈوبا ہوا
ہے قائم فقط عقلِ کُلُ سے نظام
نکلتا نہیں عقلِ جزئی سے کام

یہ دنیا کے جو ہیں نشیب و فراز
میں سب جانتا ہوں نہیں مجھ پہ راز

۱۔ جرمنی کا نامور شاعر گیٹے مفکر اور فلسفی بھی ہے۔ اس کی شاعری کا موضوع نجات انسانی ہے لیکن اس کے نزدیک یہ زہد و تقویٰ سے نہیں تجربے سے حاصل ہوتی ہے۔

۲۔ ایچی لس حامل پیدائشی معمہ عشق و نشاط تھا۔

۳۔ جورج سینٹیانا کے نزدیک روحانی ہونے سے مراد نصب العین کے شعور میں زندگی بسر کرنا ہے۔

مُعلم جو گزرا ہے سوفو کلیز[1]
سروں کا وہ سہرا ہے سوفوکلیس

کہاں ہے زمانے کا یوری پڈیس
وہ عنواں فسانے کا یوری پڈیس

جو ابسن[2] ہمارا مفکر ہوا
وہ فرسودہ باتوں کا منکر ہوا

جو برنارڈ شا[3] ہے ہمارا ادیب
زمانے میں ہے وہ اچھوتا ادیب

عجب برگساں[4] کا یہ وجدان ہے
نہ حکمت نہ دانش نہ عرفان ہے

اگرچہ عمل کافرانہ رہا
طریقہ مگر مومنانہ رہا

ہے تحقیق میں نارسا ابن حزم[5]
ہے سرشار زعم انا ابن حزم

1۔ سوفوکلیس اور یوری پڈیس دونوں ہی حامل پیغام معلم اخلاق و مفکر تھے [illegible]

2۔ ابسن۔ اس نئے ڈرامے کا موجد ہے جس نے [illegible]

3۔ مشہور ڈرامہ نگار برنارڈ شاہ۔

4۔ ہنری برگساں

5۔ ابن حزم ظاہری

اسے تو فقط اس لئے بیر ہے
کہ ممتاز و اعلیٰ ابو الخیر[1] ہے

جو قرآں میں نیکی کا مفہوم ہے
سنائی[2] کے نزدیک معصوم ہے

جو یادِ خدا ہے ہماری نجات
تو پھر موت بھی ہے مثالِ حیات

مجھے سوزِ خسرو[3] رہا ہے عزیز
یہ افکارِ رومی نے بخشی تمیز

خلوصِ سنائی جو ممتاز ہے
صداقت کی دنیا میں آواز ہے

جو بخشی گئی تھی خدائی مجھے
کٹھن ہے اب اس کی جدائی مجھے

جو مذہب کا اپنے پرستار ہے
وہ اپنے زمانے کی دستار ہے

1۔ شیخ ابو سعید فضل اللہ بن ابی الخیر (ابوالخیر) خراسان کے نواح مَنہ میں پیدا ہوئے۔ سال پیدائش 357ھ اور وفات 440ھ فارسی شاعروں میں پہلے صوفی مذہبی شاعر ہیں۔

2۔ ابو المجد مجدود بن آدم سنائی' پانچویں صدی ہجری میں پیدا ہوئے اور 545ھ میں وفات پائی۔ یہ ایران کے بہت بڑے صوفی شاعر ہیں۔

3۔ حکیم ناصر خسرو بن حارث قبادیانی 394ھ میں بمقام قبادیان حوالی بلخ میں پیدا ہوئے' وفات 465ھ میں۔

ڈریک[1] نے زمانے پہ جادو کیا
کہ اس نے مذاہب کا ساغر پیا
جو ایجابیت کا تھا بانی ہوا
نہ حکمت میں کوئی اس کا ثانی ہوا

بظاہر جو حکمت سے بیزار تھا
اگست کا[2] متے اس کی رفتار تھا
نظر اس کی عمرانیت پر رہی
ہر اک بات سچّی ہی اس نے کہی

کہاں ہے زمانے میں اب ارتیاب
جو بن جائے دنیا میں سچّا نصاب
یہ پرہو[3] کی دنیا میں ایجاد ہے
کسی کو نہ اس کا سبق یاد ہے

جو انساں ہر اک شے کا معیار ہے
تو یاں فلسفہ سارا بیکار ہے
ہر اک بات سے اس کو انکار تھا
کہ جنس و ملک سے وہ بیزار تھا

1۔ ڈریک۔ مذہب و روحانیت کا عظیم شیدائی۔

2۔ فرانس کا مشہور فلسفی اگست کامتے (1798ء تا 1857ء)

3۔ پرہو یونانی تشکیک کا بانی ہے۔ وہ 360 ق۔ م میں پیدا ہوا۔

کسی علم کا کوئی امکاں نہیں
حقیقت کا کوئی گلستاں نہیں

نظر ہیوم[1] کی ناقدانہ رہی
اگرچہ بہت کافرانہ رہی

بہائے گئے بے بسی پر ہیں اشک
نہ آیا کسی کو بھی شک اور رشک

رسل[2] نے کیا شک کو اتنا عظیم
چلی علم کی اس سے بادِ نسیم

تحیّر کا احساس زندہ رہا
تو علم و ہنر کا بھی چرچا رہا

ہے لا ادریّت کا زمانے میں راج
دیا ہکسلے[3] نے اسے بھی رواج

ہر اک علم جب سے اضافی ہوا
عقائد کا منبع قیاسی ہوا

---

1. [illegible] 1711ء [illegible] میں پیدا ہوا اور 1776ء میں وفات پائی۔

2. [illegible]

3. [illegible] وہ شخص ہے جس نے سب سے پہلے ارتیابیت کی بجائے لفظ لا ادریت کو رواج دیا۔ اس سے [illegible]
میں "[illegible]" [illegible] میں نہیں جاتے۔

تلاش علم مطلق کی بیکار ہے
کہ ہربرٹ[1] کو اس پہ اصرار ہے
تصوّر ہے مطلق کا چھپایا ہوا
اگا وہ اضافت میں پایا ہوا

زمان و مکاں میں خدا کا ظہور
جھلکتا ہے اس کا ہر اک شے میں نور
کیا پیش ہیگل[2] نے جب فلسفہ
حق علم و دانش ادا کر دیا

یہ اڈون[3] نے سب کو دلایا یقین
ہے حکمت سے انسان روشن جبیں
شوپنہار[4] کا طرفہ ایمان ہے
کہ انسان بھی فکری حیوان ہے

نظر میں ہے نیٹشے[5] کے فوق البشر
خدا سے رہا گرچہ وہ بے خبر

1۔ ہربرٹ اسپنسر اس کے نزدیک تمام علم اضافی ہے۔

2۔ جارج ولہلم فریڈرک ہیگل 27 اگست 1775ء میں پیدا ہوئے، وفات 14 نومبر 1831ء

3۔ اڈون والس۔ اس کے نزدیک ہر شخص شعوری یا غیر شعوری طور پر [illegible] سے رشتہ [illegible] متعلق کوئی نہ کوئی نظریہ ضرور قائم کرلیتا ہے

4۔ شوپنہور (1860ء 1788ء) اس کے نزدیک انسان "ما بعد الطبیعیاتی حیوان ہے"

5۔ نیٹشے (1844 - 1900)

جو مشہور عالم میں ہے ڈارونؔ[1]
وہ علم و ہنر میں مُسلّم ہے جن

عجب اصلِ انواع کی چھیڑی لے
پئے ارتقاء جو کہ انجیل ہے

ضمبانہ کی مولٹنؔ[2] نے تردید کی
نئے علم کی اس نے نیو ڈال دی

عمل ارتقاء کا جو جاری رہا
وضاحت سے اپنی وہ عاری رہا

نیوٹنؔ[3] سے ہم کو ملا جو اصول
کہا آئن سٹائنؔ[4] نے اس کو فضول

ہے نظریہ لامارکؔ[5] کا جو قبول
وہ ہے گلشنِ علم میں ایک پھول

۱۔ چارلس ڈارون یہ نظریہ ارتقا کا بانی سمجھا جاتا ہے حالانکہ مسکویہ نے اس سے پہلے یہ نظریہ پیش کیا۔

۲۔ مولٹن وہ شخص ہے جس نے مفروضہ ضمیابہ - کی بجائے Planetestmal کے مفروضے سے کائنات کی ابتداء کی توجیہ پیش کی۔ ضمیابہ فلسفے کی اصطلاح ہے۔

۳۔ اسحاق نیوٹن 1642ء میں انگلستان میں پیدا ہوا۔ اس نے حرکت کے بعض قوانین پیش کئے۔

۴۔ البرٹ آئن سٹائن 14 مارچ 1879ء میں پیدا ہوا۔ نظریہ اضافیت کا بانی سمجھا جاتا ہے۔

۵۔ لامارک۔ عمل ارتقا کی توجیہ تغیرات کے بجائے تحولات سے ہونے لگی۔ اس صورت میں لامارک کا نظریہ مقبول ہوگیا۔

جو قانونِ حرکت کا بانی ہوا
نہ پھر اس کا دنیا میں ثانی ہوا

ہے صورت بدل لیتا مادہ جو عام
اسے پھر بھی حاصل ہے شانِ دوام

نہیں ہے فنا وہ کسی حال میں
وہ ٹیڑھا بھی سیدھا بھی ہے چال میں

رہا پیرسن[1] ان میں الجھا ہوا
عقائد میں جب اس نے کچھ شک کیا

اسی سے ہوا ماخ[2] جب ہم خیال
تو سائنس کی دنیا میں آیا زوال

آئن شٹائن[3] نے یہ دکھایا کمال
کہ نقطوں میں سمٹے ہیں دنیا کے سال

یہاں گالٹن[4] نے یہ ثابت کیا
توارث پہ ماحول غالب رہا

1۔ پیرسن۔ اس کے نزدیک سائنس کا علم تخمینی احتمالات کا موجز بیان ہے۔

2۔ ماخ سائنس کے معاملے میں پیرسن کا ہم خیال ہے۔

3۔ آئن سٹائن 14 مئی 1879ء میں الم شہر کے ایک یہودی گھرانے میں آنکھ کھولی۔

4۔ فرانسس گالٹن۔ ماحولیات اور توارث کا مشہور سائنس دان۔

وگمؔ[1] نے توراث کو غالب کہا
یہی درس لوگوں کو اس نے دیا

کیا واٹسنؔ[2] نے جو اک تجزیہ
نیا باب کرداریت کا کھلا

جنیںؔ[3] ہے زمانے میں اتنا جلی
اثر ہے توراث کا بالکل خفی

اسی پر بریڈلےؔ[4] کی تقریر ہے
کہ حکمت جبلّت کی تصویر ہے

نہیں کوئی عرفیؔ[5] کو ہم سے گلہ
نہیں فلسفے میں اگرچہ صلہ

نہیں فلسفے سے کسی کو فرار
کہ ملتا ہے روحوں کو اس سے قرار

زمانے سے ہے فلسفے کا خطاب
کہ قوموں پہ آتا ہے اس سے شباب

۱۔ [illegible] نے توراث کو ماحول پر ترجیح دی۔

۲۔ [illegible] کا بانی۔

۳۔ [illegible]

۴۔ [illegible] بریڈلے [illegible] مابعد الطبیعات ان چیزوں کے لئے جن میں ہم جبلی طور پر یقین رکھتے ہیں [illegible] دریافت کرنا ہے“

۵۔ [illegible] عرفی [illegible] پیدائش ۹۶۳ھ وفات ۹۹۹ھ

اٹھائے گئے زندگی سے حجاب
زمانے کو اس نے دکھائے ہیں خواب

شلرؔ نے دلایا ہمیں یہ یقیں
کہ حکمت سے انساں ہے روشن جبیں

اسی کو میسّر یہ توفیق ہے
عمل کی اسی سے ہی توثیق ہے

وہ طوسیؒ و رازیؒ کو معلوم ہے
جو حکمت کا دنیا میں مفہوم ہے

یہ علم و ہنر کو جو اقلیم ہے
وہ عطّارؒ کو اپنے تسلیم ہے

نہ حاصل ہوا عقل کو یہ کمال
کہ حاصل ہوا اس کو خدا کا وصال

پہنچتا ہے ہر جا اگرچہ خیال
رسائی میں اس کی نہیں پر جمال

---

1. [illegible] ہے۔

2. شیخ ابو جعفر محمد بن حسن طوسی 385ھ میں بمقام طوس پیدا ہوئے وفات 460ھ۔

3. امام فخرالدین محمد رازی 543 میں پیدا ہوئے اور 606 میں بمقام ہرات وفات پائی۔

4. شیخ فرید الدین محمد [illegible] 627ھ میں مغلوں کے ہاتھوں شہید ہوئے

رسلؔ[1] نے نکالے جو حکمت کے سُر
تو ہات آئے اس سے زمانے کو گُر

فضیلت ہے حکمت سے انسان کی
نشانی یہی تو ہے ایمان کی

بد و نیک کی اس سے پہچان ہے
یہ انسان کی آفاق میں شان ہے

وہ لیتا ادب سے ہے حکمت کا نام
کہ سسروؔ[2] نے اس کو دیا یہ مقام

صداقت کا ہر شخص جویا رہا
حکیم اس کو پانے میں کھویا رہا

نظر میں ہے ملٹنؔ[3] کی جو فلسفہ
وہ اس سے ہمیشہ خفا ہی رہا

جہاں گوئٹےؔ[4] بھی نہ داخل ہوا
وہاں فلسفی آج مائل ہوا

1۔ برٹرنڈ رسل

2۔ روما کا جادو بیاں سسرو جس کے فلسفہ سے متعلق یہ الفاظ قابل توجہ ہیں "اے فلسفے کی روح، اے ہماری زندگی کی رہنما، نیکی کی دوست اور بدی کی دشمن، تیرے بغیر ہم کیا اور ہماری زندگی کیا؟"

3۔ ملٹن جو شاعری میں ممتاز مقام رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک فلسفہ دوزخیوں کا مشغلہ ہے۔

4۔ گوئٹے جس نے فاؤسٹ میں معرکے متعلق اپنی تلخ رائے کا اظہار کیا تھا۔

اگرچہ کہ ٹامس[1] بھی جاہل نہیں
مگر فلسفے کا وہ قائل نہیں

کلیسا میں مجھ کو ملا سینٹ[2] پال
وہ لفظوں کی چھتا نہیں کوئی چال

برہنہ صداقت پہ ہے وہ نثار
یہ مذہب کی اس کے شگفتہ بہار

تھا کنفیوشس[3] دنیا میں ایسا حکیم
دیا فلسفہ اس نے سب کو قدیم

وہ لگتا تھا الہام سے سرفراز
بجایا تھا اخلاق کا اس نے ساز

جو گاتا رہا ساز پر اپنے سیانگ[4]
بڑھی بزمِ وجدان میں اس کی مانگ

عطا کنفیوشس نے کی کہنہ شراب
کھلا میکدے میں مروت کا باب

اصولوں کو اس نے مُدوّن کیا
فضائل کو انساں کا مخزن کیا

1۔ ٹامس ہابس جس کے نزدیک فلسفے کی کوئی اہمیت نہیں۔

2۔ سینٹ پال کا تقاضا ہے کہ "تمام چیزوں کو جانچو، صرف اسی چیز کو مضبوط پکڑو جو اچھی ہو"۔

3۔ حکیم کنفیوشس 550 یا 551 قبل مسیح ریاست لو میں پیدا ہوا۔ اسے قدیم روایات کا محافظ سمجھا جاتا ہے۔

4۔ ماہر موسیقار سیانگ جو کنفیوشس کا شاگرد تھا۔

لاوزاء[1] نے دنیا کو سمجھا حقیر
تعلق پہ لوگوں کے کھینچی لکیر

کیا کنفیوشس سے اس نے مذاق
وہ کہتا تھا دنیا کو کر دیجیے عاق

جو حکمت میں استاد برہان[2] ہیں
وہ اس پر دل و جاں سے قربان ہیں

وہ لیتے ہیں قرآن سے جب شگون
ہے علم اور منطق کا بنتا ستون

ہے الہام دنیا میں ہر شے کا حل
تقاضا ہر اک سے کہ اس سمت چل

وہ مِلّت پہ اپنی پریشان ہے
وہ اپنے زمانے کا لقمان ہے

رکھیں فلسفہ میں وہ باریکیاں
چھٹیں جن سے ذہنوں کی تاریکیاں

کتابوں میں جو عین معراج ہے
وہ برہاں کی تصنیف منہاج ہے

ہیں باتیں بہت دلکش و دل نشیں
ہے پیش نظر اس کے تجدید دیں

۱۔ [illegible]

۲۔ [illegible]

بیاں کنفیوشس[1] نے کی لفظوں کی شان
جو دنیا میں ہیں سارے رشتوں کی جان

جلایا نہ زاو[2] نے ایسا چراغ
کہ جس سے مٹے زندگی کا سراغ

کسی فلسفے سے نہ بدلا دماغ
کہ ماتھے پہ رقصاں تھا ظلمت کا داغ

رہی بات یہ مینشس[3] کو قبول
کہ فطرت کی دنیا میں انساں ہے پھول

جسے رب نے فطرت پہ پیدا کیا
سبق اس کو پھر راہ حق کا دیا

زمانے میں فطرت نہیں کوئی چیز
نہیں نیک و بد میں کوئی بھی تمیز

یہی کاؤ[4] نے سب کو تلقین کی
بسر عیش و عشرت سے ہو زندگی

---

1. کنفیوشس چین کا عظیم مفکر
2. زاو کنفیوشس کا ایک شاگرد
3. مینشس کنفیوشس کا شاگرد جو 371 قبل مسیح میں پیدا ہوا اس کا چینی نام منگ [illegible] ہے۔
4. چینی مفکر کاؤ جس کے نزدیک انسانی فطرت نہ نیک ہے نہ بد۔

اٹھایا قدم جب مہاویر[1] نے
بدل ڈالا رخ اس کا تقدیر نے

ناگ ارجن[2] نے گوتم[3] پہ تنقید کی
کسی کی نہ گوتم نے تقلید کی

ہے نظریہ اس کا بڑا خوفناک
اڑاتا ہے دونوں جہانوں کی خاک

نہیں روح کا جب جہاں میں وجود
خدا کا کہاں ہے زمیں پر شہود

خدا کا نہ گوتم کو اقرار ہے
نہ روحوں سے کچھ اس کو انکار ہے

ششی آنند[4] اس پر پریشان ہے
کہ رسوائیوں کا یہ سامان ہے

ہے گوتم کا حامی مگر ناگسین[5]
بجائی ہے جس نے عدم ہی کی بین

1- جینی فلسفے کا بانی تاریخی نقطہ نظر سے مہاویر وردمان ہے یوں تو ریسہ اور پارس ناتھ کے بھی نام آتے ہیں۔

2- بدھوں کا ایک مشہور عالم ناگ ارجن ہے جو گوتم کے نظریات کا نقاد ہے۔

3- گوتم بدھ سدھارتھ 597 قبل مسیح کپل وستو میں پیدا ہوا۔

4- گوتم بدھ کا عزیز ترین شاگرد آنند ہے۔

5- دوسرا مشہور بدھ عالم ناگ سین ہے۔

فریب نظر ہے ہر اک کا وجود
نہیں ہے یہاں پر کسی کا شہود

ہے زرتشت[1] کا بھی مجھے احترام
کہ پیغمبروں[2] میں ہوا جس کا نام

اُسے دل سے اقرار توحید تھا
کہ دینِ عمل اس کی تمہید تھا

خداوند کا آگ مظہر ہوئی
جبھی اس کی نظروں میں اکبر ہوئی

نہ دستور مانی[2] کا رائج ہوا
نظر سے وہ لوگوں کی خارج ہوا

بنی نور و ظلمت سے یہ کائنات
نہ پنپا کبھی اس سے نخلِ حیات

پسند اس کو تھا اشتراکی نظام
تھا مزدک[3] زدانشوران عزام

وہ مانی جو عیسیٰ کا نائب ہوا
ہر اک قول میں اپنے صائب ہوا

---

1. زرتشت پہلا ایرانی پیغمبر ہے جس نے ثنویت کو وحدت میں تحویل کرنے کی کوشش کی
2. مانی مینون کے شہر میں 215ء میں پیدا ہوا۔
3. مزدک مانی کا پیرو تھا اور وہ اپنے افکار کے لحاظ سے اشتراکی سمجھا جاتا تھا۔

یہ دعویٰ تھا دنیا میں مرقیون[1] کا
نجاتوں کا عیسیٰ ذریعہ بنا

بتایا یہ لوگوں کو ویصانؔ[2] نے
بچے گا ہر اک شخص ظلمات سے

نہیں ہے زمانے میں ایسا امام
لبوں پر ہو جس کے الٰہی کلام
بتائیں ہمیں کوئی بھی ایسا نام
زمانے میں ہو جس کا اب فیضِ عام
یہاں پر نہیں کوئی ایسا نظام
کہ جس میں ہو انسانوں کا احترام

نہیں ہے سنائی[3] سا کوئی طبیب
کہ بیمار جس کو سمجھ لے حبیب

دبستانِ رومی[4] نظر میں نہیں
شجر جیسے کوئی گزر میں نہیں

کہاں ہے زمانے میں اب پیرِ روم
کہ کُھل جائیں جس سے رموزِ علوم

۱۔ مرقیون مانی کا پیش رو تھا۔

۲۔ اس دعوے سے متعلق [illegible] ویصان بھی مانی کا پیش رو ہے اور یہ 154ء میں پیدا ہوا۔

۳۔ [illegible] سنائی [illegible] پانچویں صدی ہجری میں پیدا ہوئے۔ وفات 545ھ میں ہوئی۔

۴۔ [illegible] رومی [illegible] میں بمقام بلخ پیدا ہوئے۔ وفات 712 میں ہوئی۔

نہیں کوئی منصور اس دور کا
نہیں دار کوئی یہاں نور کا

نہ حفظِ مراتب ہے کوئی یہاں
کروں کس سے یہ بات آخر بیاں

خرد ہے زمان و مکاں کی اسیر
سمجھتی ہے گرچہ وہ سب کو حقیر

جو میں نے پڑھی دل سے ضربِ کلیم
ملا اس سے کتنا سکوں اے ندیم

ہوئے جملہ بیکار یہ چشم و گوش
ہوئے سب پہ غالب فقط ناؤ و نوش

خودی کی یہاں کوئی منزل نہیں
کہ جھکتی ہے خواجہ کے در پر جبیں

ہیں عاشق ہوئے جب سے اہلِ ہوس،
نہیں ضبط میں آج کوئی نفس

خودی کو بتایا ہے رازِ حیات
میسّر نہیں جس کو کوئی ثبات

فریبوں میں جانے ہیں کب سے اسیر
خودی کو کہا ہم نے صورت پذیر

نہیں اس سے روشن کسی کی نظر
حذر اس سے کیجئے خدارا حذر

بتایا ہے انساں کو عالم کبیر
مقابل میں اس کے ہے دنیا صغیر

ہے آدم تو خود عین ام الکتاب
ہے وا ہوتا جس سے حقیقت کا باب

جو آہنگ ہے فلسفے کو ملا
وہ رادھا کرشنن[1] نے اس کو دیا

جو ہندی میں اس نے کرشمہ کیا
وہ رادھا کرشنن کا ہے فلسفہ

جو ٹیگور[2] گیتانجلی میں ملا
تو حکمت کا گلشن نظر میں کھلا

وہ ہے شیخ عیسیٰ[3] جو حکمت کا باب
لکھی ہے مذاہب پہ اس نے کتاب

جو گینوں[4] روایت کا ہے ترجماں
وہ فکر و نظر کی بنا ہے زباں

1۔ ڈاکٹر رادھا کرشن، فاضل و محقق شہرۂ آفاق مصنف، بلند پایہ فلسفی۔

2۔ رابندر ناتھ ٹیگور

3۔ شیخ عیسیٰ نور الدین احمد (معروف شوآن) جو آج مغرب میں حکمت جاوداں اور معرفت دین کے سب سے بڑے ترجمان ہیں۔

4۔ رینے گینوں یا شیخ عبدالواحد یحییٰ (وفات 1951ء)

نظر میں ہے جس کی یہاں کونیات
وہ رکھتا ہے پیشِ نظر نفسیات
وحی سے جو ہے منسلک کائنات
نظر آئی اس میں خدا کی صفات
جو یحییٰ[1] نے لکھی ہے "عرفانِ ذات"
ملیں اس میں حکمت کی جملہ صفات
سمتھ[2] کی نظر میں جو ایمان ہے
وہ صدیوں کے انساں کی پہچان ہے
نہیں جس کی قیمت وہ ہے کونیات
مگر اس سے قائم ہے انساں کی ذات
یہ ہے فکرِ سُدّی[3] کا صفدر کمال
دکھائے ہیں اس میں عروج و زوال
ہیں ارضی مراتب بھی پیشِ نظر
روایت سے ممکن نہیں ہے حذر

---

1. [illegible]

2. [illegible]

3. [illegible] (Lord North Bourne)

نظر میں ہے جس کے یہ عالم جدید
مذاہب کی لایا وہ معنی نوید

نصرؔ[1] کا ہے اپنا یہ پختہ خیال
نہیں دین و حکمت کو کوئی زوال

ہیں مشرق کے عالم یہاں محوِ خواب
نہ گمراہ مغرب کا کوئی جواب

یہ جس نے کہا وہ ہے عالم سہیلؔ[2]
نہیں فلسفہ کوئی بچوں کا کھیل

نئے فکر کی جس نے ڈالی ہے بیل
وہ رکھے گا ماضی سے بھی اپنے میل

دو عالم ہیں اس میں سمائے ہوئے
ہے گویا نفس زخم کھائے ہوئے

ہر اک شے سے انسان برتر رہا
زماں و مکاں میں وہ اکبر رہا

ہے ایمان لوگوں کا نام و نمود
مٹا ہے سراسر ضمیرِ وجود

زماں و مکاں ہیں ترے سامنے
جہاں کے جہاں ہیں ترے سامنے

۱۔ سید حسین نصر

۲۔ محمد سہیل عمر

کرو ذات میں اپنی پیدا جمال
کہ رقصاں رہے تا نظر میں جلال

نہ کشور کشائی کو معبود کر
نہ دنیا میں اس شے کو مقصود کر

میسر نہیں بے نیازی ہمیں
نہ بھایا کبھی حرف رازی[۱] ہمیں

نہیں ہے یہاں پر کوئی حق شناس
کہاں کام آئے گا ظن و قیاس

قلندر جہاں کا محاسب ہوا
زماں اور مکاں کا وہ راکب ہوا

نہیں ہم میں کوئی بھی خیبر شکن
پڑی کب سے ویراں ہے یہ انجمن

ازل سے ہے خودبیں محبت یہاں
جہاں میں رہی ہے اخوت یہاں

صدف کوئی گوہر سے خالی نہیں
حقیقت جہاں میں خیالی نہیں

نہیں کوئی عیسیٰ یہاں بے صلیب
ہر اک آدمی ہے یہاں بدنصیب

۱۔ [illegible]

لکھی شیخ سعدیؒ نے ایسی کتاب
نہیں جس کا دنیا میں کوئی جواب

ملی جس سے پڑھ کر بصیرت ہمیں
کہ دیتی ہے وہ درس عبرت ہمیں

نظر میں نہیں ہے علی بن حسینؒ
میسر نہ آیا کبھی جس کو چین

ہے قابوس نامہ مرے سامنے
لگے پڑھ کے ہم جس کو دل تھامنے

المعالیؒ نے درس محبت دیا
ہے نیکی کا دنیا میں چرچا کیا

ابوالفضلؒ ایسا مورخ ہوا
رقم اس نے بابِ حقیقت کیا

حجازیؒ ہے ایراں کا ناول نگار
ڈرامے، فسانے کا ہے شہسوار

[illegible] ولادت 620 یا 615 ہجری وفات 691ھ

[illegible] ولادت 930ھ مطابق 1533ء

[illegible] 412ھ میں پیدا ہوا۔

[illegible] 470ھ میں وفات پائی

[illegible] مشہور مصنف ہیں۔

ابوالخیر[1] نے وہ بتائے نکات
ہوئی جن سے دنیا میں تکمیل ذات

حسن سنجری[2] حق سے مانوس ہے
وہ ولیوں کی محفل کا فانوس ہے

نہیں ہے جو چہرے پہ میرے نقاب
تو نازل ہے واعظ کا مجھ پر عتاب

کوئی بات زاہد کی مانی نہیں
سو بے داغ میری جوانی نہیں

نہ آئے نظر جن کو اپنے عیوب
سمجھنے لگے اپنے عیبوں کو خوب

لگائی ہے قوموں نے خوں کی سبیل
یہ تہذیبِ نو کی ہے شانِ جمیل

جو قومیں ہیں دنیا میں بے سیم و زر
نہیں ان کی قسمت میں کوئی سحر

تصادم میں آئے ہیں روس اور چین
فلک نے دیکھایا یہ قوموں کو سین

لہو میں ہے ڈوبا ہوا ویت نام
یہ کمپوچیا کی شفق پوش شام

---

1. ابو سعید ابوالخیر 357ھ میں پیدا ہوئے اور وفات 4 شعبان 440ھ میں ہوئی۔

2. نجم الدین حسن سنجری دہلوی 652ھ میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔

پریشاں یوگنڈا و تنزانیہ
کہاں ہے مسلماں کا ہسپانیہ
خراب اور خستہ سمرقند ہے
جو اپنی زمیں پر نظر بند ہے

ہے خنجر کی زد پر جنوبی یمن
جو ضربِ مسلسل سے ہے خستہ تن
کیا جب سے میثاق سادات[1] نے
ہے مارا عرب کو مساوات نے

نشاں امن کا وہ سعودی عرب
ہے فتنے کا چشمہ یہودی عرب
ہے مشہور دنیا میں جو اسرائیل
حقیقت میں ٹھہرا ہے وہ میکائیل

بہا ہے لہو اپنا ایران میں
نہیں کوئی الفت اب افغان میں
اُڑی خاک ہند اور یونان میں
نہیں ہے مزہ خوں کے اشنان میں

بتا آج انسان طبقات میں
قیامت ہے ارض و سماوات میں

---

[1] [illegible]

غریبوں کا دشمن ہے سرمایہ دار
ہے خاموش اس پر بھی پروردگار

جو رائج زمانے میں قانون ہے
رواں اس کی رگ میں مرا خون ہے

نہیں ہے کسی کو یہاں پر وثوق
کہ حاصل ہیں انساں کو سارے حقوق

خدا بن چکے ہیں پرانے رواج
کہ خاروں کے سر پر ہے پھولوں کا تاج

جو آزادیاں پابہ زنجیر ہیں
وہ فکر و نظر پر بھی تعزیر ہیں

جو معبد میں ٹھہرے ہیں بن کر مکیں
بنے وہ حقیقت میں گوشہ نشیں

جو قوموں کی مجلس سجائی گئی
پری امن کی ہے نچائی گئی

اناؤں کے ہاتھوں میں ہتھیار ہیں
سو زیر و زبر دل کے سنسار ہیں

نظر میں فرنگی جو مجذوب ہے
خدا کی نظر میں وہ محبوب ہے

سروں پر جو بم آ کے گرنے لگے
سرِ میکدہ رند بھرنے لگے

یہ آدم کا دھرتی پہ شہکار تھا
کہ لاشوں کا سڑکوں پہ انبار تھا

سروں پر جہازوں کی پرواز تھی
فضا میں ضمیروں کی آواز تھی

فضائیں لہو سے ہیں خونیں بنی
تو لاشیں زمیں پر ہیں بکھری ہوئی

ہیں گدھ جن کو بڑھ بڑھ کے کھانے لگے
یہ مردہ بدن اب ٹھکانے لگے

لہو جب سے دنیا میں ارزاں ہوا
تبہی کا لوگوں کی ساماں ہوا

مُقیّد ہوئی جب سے صنفِ لطیف
ہوا ہے رگوں میں لہو بھی کثیف

جو لگتا ہے ظاہر میں تم کو شریف
وہ قول و عمل میں ہے اپنے ضعیف

لہو دیکھ کر دل کو وحشت ہوئی
ہے یہ جنگ وجہِ ہلاکت ہوئی

محافظ ہمارا جو خائن ہوا
وہ دنیا میں ایماں کا ضامن ہوا

نہیں کوئی ملّت میں جب اتحاد
کرے گا بھلا کوئی کیسے جہاد

کفن کا جو پرچم بنایا گیا
تو منبر سروں سے سجایا گیا

بڑی تیز ہے آج خنجر کی دھار
نہ جائے گا خالی زمانے کا وار

ہے قاضیٔ شہر اب بڑا بدگمان
کہ خطرے کی زد پر ہیں ایمان و جان

نیا رخ دکھایا ہے افغان نے
ہے کروٹ ادھر بدلی ایران نے

دہانے جو توپوں کے کھلنے لگے
تو شعلے لہو کے اگلنے لگے

فضاؤں میں اب تک ہے چیخ اور پکار
کہ بیوہ ہے دنیا میں سینہ فگار

جو کتوں نے لاشوں کو کھینچا یہاں
تو سڑکوں کو خوں سے ہے سینچا یہاں

گھروں کو زمیں پر لگائی ہے آگ
اجل نے بجایا تباہی کا راگ

ہے رسمِ وفا جب لہو سے چلی
عزیز و اقارب ہوئے اجنبی

جو ممتاز دنیا میں تھا ایشیا
وہ یورپ کے ہاتھوں بنا ویشیا

مراکش بنا آج مہماں نواز
کہ سیکھے ہیں اس نے بھی ناز و نیاز

فلک بوس ایوان کھنڈرات ہیں
کہ تہذیب نو کے یہ ثمرات ہیں

میسر نہیں ہیں جنہیں گورکند
ہوا ہے درگور دنیا میں بند

کہاں گوئٹے[1] کا وہ علم و ہنر
نہیں شیکسپیئر[2] کا یہاں پر گزر

پھڑکتا نہیں ہے پرندہ جہاں
کہ پہنچے ہیں جاپان و جرمن وہاں

ہے طاقت ہی دنیا میں ٹھہری اصول
مباحث ہیں سارے کے سارے فضول

سروں پر برستی ہیں جب گولیاں
تو لاشوں کی پڑتی ہیں پھر بولیاں

وہ لائے جنہیں نوکِ سنگین پر
نچایا گیا ان کو پھر بِین پر

نہیں غم میں کوئی کسی کا شریک
کہ رشتے ہیں انسانیت کے رکیک

۱۔ [illegible]

۲۔ [illegible]

نصیحت نہیں ہے کوئی کارگر
جھکایا گیا ہے فضائل کا سر

لغت میں نہیں کوئی رحم و کرم
ازل سے نہیں ان کا کوئی بھرم

ممالک ہیں چکر میں آئے ہوئے
لگے لوگ کچھ مار کھائے ہوئے

جو لکھی ہے میں نے لہو سے کتاب
بنے گی زمانے کا وہ بھی نصاب

مہاشا ہے پھولوں کی آغوش میں
کہ دیوی ہے مندر کی پاپوش میں

رہا ہے ازل سے ہی طاقت کا دور
رہا ہے سدا غلبۂ ظلم و جور

ممولے کے ہاتھوں میں شاہین ہے
کہ رائج جو ظلمت کا آئین ہے

زمانے کا خوں ہو گیا ہے سفید
پریشاں ہے اس دور کا اب جنید

لہو اب زمیں پر ضیا پاش ہے
کہ زخمی اندھیروں سے آکاش ہے

ملی صدیوں میں جو ہیں آزادیاں
ہوئیں ان سے دنیا میں بربادیاں

زمیں پر نہ اب کوئی دلبر رہا
کہ برپا کلب میں نہ محشر رہا

نہ در پر حسینوں کے دربان تھے
کہ سب کوچے بازار سنسان تھے

نہ گلیوں میں طبلے کی اب تھاپ تھی
نہ ہونٹوں پہ اب لمس کی بھاپ تھی

اداسی کی چہرے پہ جو چھاپ تھی
طوائف تماشائی خود آپ تھی

نہ گلیوں میں کُتّوں کی آواز تھی
نہ شیشہ بدن اب کوئی راز تھی

جو چلمن بدن کی اٹھائی گئی
تو آنکھوں کی مشعل بجھائی گئی

ہیں جلوہ فگن آج بے تابیاں
نگاہوں میں رقصاں ہیں بے خوابیاں

بدن کی جو لذّت سے محروم تھے
نظر میں وہ لوگوں کی معصوم تھے

بظاہر کوئی اب شرابی نہیں
کہ کسی کسی کی بھی بھابی نہیں

کیا جس نے خنجر کو سینے سے پار
وہ زخموں کی لایا بدن پر بہار

زر و سیم سے جیب خالی ہوئی
کرن ظلمتوں میں سوالی ہوئی

ہوئے آج برباد جس سے فنون
اسی سے ملا واعظوں کو سکون

یہ اچھا نہیں میکدے میں شگون
کہ جس سے بڑھا میکشوں کا جنون

جو اقوامِ عالم میں ہے جرمنی
ہے علم و ہنر میں مہا پدمنی

بھرا رنگ شیریں میں نقّاد نے
کیا ہے گلہ آج فرہاد نے

ہوا ہے غلاموں پہ یہ راز فاش
کہ روحوں کو کرتے نہ نیلام کاش

دلوں میں نہیں کوئی سوزِ یقیں
کہاں سوگئے ہیں حرم کے مکیں

الاپا یہ کس نے محبّت کا راگ
کہ روح و بدن میں لگی جس سے آگ

عقائد سے اپنے میں بیزار ہوں
دو چار بسا وہم و افکار ہوں

گھرا ہوں الم ناک حالات میں
کہ رقصاں غزل ہے خرابات میں

کھلا ہے یہ اشکوں کا کیسا کنول
کہ آئی ہے کانٹوں پہ چل کر اجل
نہ باقی رہے گا کسی کا بھرم
کہ شعلوں کی زد پہ ہیں لوح و قلم

لئے اپنے ہاتھوں جو دیر و حرم
تو ٹوٹا زمانے میں سب کا بھرم
پریشاں یہاں آج نمرود ہے
کہ بے دست و پا آج محمود ہے

جو عظمت کا باعث تھے علم و فنون
ہیں آثار ان کے شکستہ ستون
میں سمجھا جِسے اپنا معراج فن
وہ تھا سنگِ مرمر کا دل پر کفن

بلاکو و چنگیز کہاں ہیں یہاں
کہ دوشِ ہوا پر صدا ہیں یہاں
کیا دفن شیریں کو پرویز نے
کہ لوٹا ہے یہ دہر چنگیز نے

زمانے میں جو اہل جمہور ہیں
نظر میں ہماری وہ تیمور ہیں
مرے دور میں کوئی بسمل نہیں
نظر میں کوئی آج محمل نہیں

حکومت کے وہ ہی سزاوار ہیں
کہ ملّت میں جو لوگ غدّار ہیں

مری قوم کے جو نمک خوار ہیں
وہ اعمال میں اپنے مختار ہیں

تصادم ہے افکار و ہفوات میں
قیامت بپا ہے خیالات میں

مذاہب گئے ہیں مماثل ہمیں
سکوں ہوگیا ان سے حاصل ہمیں

کئی شہر زیر و زبر ہوگئے
ممالک ہیں کتنے کھنڈر ہوگئے

کئی ہستیوں میں ہے بانٹا مجھے
ہے خواہش کی دیمک نے چاٹا مجھے

نہیں شیخ جی کا یہاں کوئی کام
کہ ہے پارسائی یہاں پر حرام

سرِ دار آکر پلا ساقیا
کہ چہرے سے پردہ اٹھا ساقیا

افق پر کہیں اب سویرا ہوا
جُدا اب زمیں سے اندھیرا ہوا

جو شاخیں گلستاں میں ہلنے لگیں
تو کلیاں محبت کی کھلنے لگیں

زباں نفرتوں کی جو سلنے لگی
کدورت دلوں سے نکلنے لگی

جو مالک کلب کے بھی نائی ہوئے
تو پھر ڈاکٹر بھی قصائی ہوئے

خزانوں میں جب ناگ پالے گئے
تو ڈسنے سے پھر وہ نہ ٹالے گئے

جلے ہیں کلب جو شبستان میں
تو شہرت رہی ان کی ایران میں

جو پھولوں نے اب آگ برسائی ہے
تو قہرِ خدا بن کے وہ چھائی ہے

گلستاں میں جب قحط سالی ہوئی
خزاں میں نظر پھر سوالی ہوئی

جو ناگن شبستاں میں پلی گئی
شب غم کی آنکھوں سے لالی گئی

نہیں میکدے میں جو جام طرب
نظر آئے کچھ رند واں تشنہ لب

نہیں روشنی کوئی احباب میں
کہ ڈوبے ہیں ظلمت کے سیلاب میں

نہیں ہے کسی کو کسی سے لگن
نظر کی اجڑنے کو ہے انجمن

میسّر نہیں چاندنی کا کفن
کہ دوزخ میں جلتے شیشہ بدن

نظر میں نہیں ہے مرے کوئی خواب
کہ ڈھلنے لگا ہے تمہارا شباب

جو عشق و محبّت کی رسمیں نہیں
یہ قلب و نظر میرے بس میں نہیں

کسی نے نہ راہوں کے کانٹے چنے
نہ تاروں کے دھرتی پہ سائے بنے

اداسی منڈیروں پہ رقصاں ہوئی
قیامت کا دھرتی پہ ساماں ہوئی

سنا میکدے میں اجل کا پیام
کہ گردش میں کب تک رہے گا یہ جام

کہ کل تک جو ایراں میں جرنیل تھے
وہ کیڑوں مکوڑوں پہ فرنیل تھے

جو گم گشتہ جنت کا محتاج تھا
تو ملٹن[1] کا دل تخت و تاراج تھا

رہا گوئٹے[2] جو ہمارا حکیم
ہوا ضرب سے وہ ادب کی دونیم

1۔ ملٹن اپنے وقت کا عظیم شاعر

2۔ گوئٹے جو "فاؤسٹ" کا مصنف ہے۔

نظر میں یہ صورت بھی سنگین تھی
کہ ہر لحظ مشکل میں تکوین تھی

نہ دیں ہم کو ممبر پہ چڑھ کر سبق
نہیں ہے مُروّت کی تم میں رمق

جو احسان کرکے جتاتے نہیں
وہ انسان کی عظمت گھٹاتے نہیں

سمجھتا نہیں ان کو کوئی نفیس
ہیں آوارہ گلیوں میں اپنے رئیس

نظر آرہے ہیں وہ بہکے ہوئے
تو اشراف گھر گھر ہیں سہمے ہوئے

جو بزدل بنے ہیں زمیں پر شریف
وہ قول و عمل میں ہیں اپنے نحیف

پڑوسی سے اپنے وہ ملتے نہیں
کبھی گھر سے باہر نکلتے نہیں

جو خوفِ خدا اب دلوں میں نہیں
وفا دار کوئی ملوں میں نہیں

خدا سیم و زر پر مُعلّم ہوا
تو طوفان برپا خودی کا کیا

مٹانے کو ہو تم ہمارا نشاں
کہ کاٹی ہے تُم نے ہماری زباں

جو لوگوں کو رہبر نے دھوکا دیا
تو برباد اس نے وطن کو کیا

لٹیرے ہوئے جب ہمارے وزیر
تو دیکھے ہیں ہم نے امیر و کبیر

لہو میں ہمارے حرارت نہیں
کہ جینے کی ہم میں علامت نہیں

خلوص و وفا کا جو روگی ہوا
زمیں پر ہماری وہ جوگی ہوا

جو مرزا[1] و سودا[2] تھے فن کا سنگھار
تو علم و ادب کی تھی رنگیں بہار

نہیں جس سے کوئی بھی حاصل وصول
وہ جدّت طرازی ہے ایسی فضول

دیا تھا ثقافت کو جس نے لباس
وہ بزمِ ادب میں کھڑا ہے اداس

اکھڑنے لگی ہے زمانے کی سانس
کہ کھینچی ہے میں نے زمانے کی راس

---

1. مرزا اسد اللہ غالب 1796ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے وفات 1869ء میں۔

2. مرزا رفیع سودا

کہاں ہے زمانے کا وہ ماؤ زتنگ[1]
کہ جس نے سکھائے تھے جینے کے ڈھنگ

برہنہ زمانے کی بلقیس ہے
کہ چھایا ہوا آج ابلیس ہے

ہر اک شخص دنیا میں بے آب ہے
امنڈتا ہوا ایک سیلاب ہے

پریشان اس دن سے لقمان ہے
کہ بیمار جس دن سے انسان ہے

جبیں پر خودی کے لہو کا ہے نور
کہ مہدی کا ہوگا کہیں پر ظہور

جو سرکش کے پاؤں میں ہیں بیڑیاں
رگڑنے لگا ہے وہ اب ایڑیاں

نہیں ہے بھرم کوئی محلوں میں آج
سلگتا سا موسم ہے شعلوں میں آج

ہیں رقصاں تمنائیں کس روپ میں
کہ سڑکیں ہیں جسموں کی اب دھوپ میں

کوئی سانپ نالے میں ڈوبا کہیں
کہ بھونرا اجالے میں کھویا کہیں

---

[1] ماؤ زتنگ: چین کا ممتاز رہنما

جو زلفوں میں مجھ کو وہ کستی رہی
لبوں کو مرے رات ڈستی رہی

گئی تب حسینہ بدن ناچتے
کہ محشر لگا تب وہاں ناچتے

قصیدہ نویسوں نے نوحہ کیا
کہ آقا ہے محلوں سے رخصت ہوا

وفادار اب کوئی خادم نہیں
جو توہین پر اس کی نادم نہیں

جو عادل تھا دنیا میں نوشیرواں[1]
عدالت کو پہنچایا اس نے کہاں

نہ اس میں تھی حشمت جہانگیر کی
نہ عظمت تھی اس میں مہابیر کی

جو جاروب کش اٹھ کے چلنے لگے
تو شاہوں کے کس بل نکلنے لگے

جو اورنگ و افسر ہوئے تھے فقیر
وہ قرطاسِ عالم پہ ٹھہرے کبیر

جو پتھر پہ شیشہ رگڑتے رہے
وہ خسرو[2] کے سر کو کچلنے لگے

---

1. ایران کا بادشاہ نوشیرواں جو اپنے عدل کی وجہ سے مشہور تھا۔

2. خسرو بادشاہ

جو بھوکی زمانے میں مخلوق ہے
وہ لوگوں کے ہاتھوں میں بندوق ہے

ہیں لوگوں کے ہاتھوں میں خونیں قلم
ادیبوں نے توڑے ہیں اپنے قلم

جو لڑتے نہیں اب بقا کے لئے
وہ محتاج ہیں اب دعا کے لئے

اجل جب سے دنیا میں سستی ہوئی
یہاں عام مردہ پرستی ہوئی

لہو میں ہمارے نہیں ہے ترنگ
کہ جینے کی باقی نہیں ہے امنگ

تو آیا ہے زیرِ فلک اب کہاں
یہاں کانپتے ہیں زمیں آسماں

مصیبت سے ہم کو نکالے گا کون
جو گرتے ہیں ان کو سنبھالے گا کون

لہو سے لکھی میں نے ایسی کتاب
بنے گی تواریخ کا ایک باب

پشیماں ہے ملت پہ عبدالعزیز
کہ کھوٹے کھرے میں نہیں ہے تمیز

کوئی زیرِ دست اب تو بس میں نہیں
پرندہ جنوں کا قفس میں نہیں

مبارک ہو تم کو ہماری اجل
سرِ دار آئی ہے زخمی غزل

فضا میں بکھرنے کو انسان ہے
کہ ارتھی پہ شعلوں کی بھگوان ہے

مُیسّر نہیں ہم کو رحم و کرم
کھلا سب کا معبد میں جا کر بھرم

لٹی چاندنی میں جو رقصاں غزل
تو اشکوں میں ہنسنے لگے ہیں کنول

غزل جب سے مجھ پر ہوئی ہے نثار
تو ہاتھوں میں زخمی ہے اپنی ستار

ہوا کون جنگل میں آکر شکار
کہ آہو لگے ہیں مجھے بیقرار

ملازم کو اپنے نہ سمجھو حقیر
کہ ہاتھوں کی ٹھہرا ہے وہ بھی لکیر

جو روح و بدن کے بھی مالک ہو تم
تو اپنی طریقت میں سالک ہو تم

لہو ہے عبادت کا چہرے پہ آج
کہ معبد میں ہے کون پہرے پہ آج

فضا کی فضا ہی جھلسنے لگی
کہ زلفِ پریشاں الجھنے لگی

بکے گی زلیخا نہ بازار میں
چھپے گی خبر یہ بھی اخبار میں

جو اشکوں کے جال اپنے بُننے لگے
ستارے فلک سے وہ چُننے لگے

ہوا عقل کا جب سے جذبہ اسیر
تو جلنے لگا چاندنی میں شریر

میں اقلیمِ فن کا نہیں ہوں دبیر
نہ رقصاں ہوئی مجھ میں روحِ کبیر

بدلتی نہیں ہے زمانے کی رت
کہ لفظوں کے میں نے تراشے ہیں بت

جو کاٹے ہیں دستِ دعا آپ نے
تو کھینچی سروں سے رِدا آپ نے

جو دلدل میں ناؤ کو کھیتے رہو
یونہی داد جینے کی دیتے رہو

جُنوں کا ہر اک وار سہتے رہو
یونہی سانس صحرا میں بہتے رہو

جہاں کا نہیں غم اگر تجھ کو راس
نہ ہوگا تجھے پھر کسی کا بھی پاس

اتارا ہے پھولوں نے اپنا لباس
چمن میں ہیں شاخیں برہنہ' اداس

ہے اشکوں کی گردن میں مالا کہاں
محبّت کا ہے بول بالا کہاں

غموں کو جہاں نے سنبھالا کہاں
کسی سانپ کو ہم نے پالا کہاں

ہے محروم پھولوں سے سارا چمن
لگا اجنبی آج اپنا وطن

نہیں ہے کسی کو چمن سے لگن
ہے خاروں سے پھولوں کا زخمی بدن

جو یادوں کی چلمن اٹھاتی رہی
وہ نشتر سا دل میں چلاتی رہی

مرے درد کو وہ بڑھاتی رہی
لہو جو دیئے میں جلاتی رہی

جہانِ طرب میں یہ آیا ہے کون
فضائے دل و جاں پہ چھایا ہے کون

یہ آشوب میں مسکرایا ہے کون
یہ ظلمت میں اب جگمگایا ہے کون

درِ میکدہ پر یہ آیا ہے کون
یہ سوغاتِ آشوب لایا ہے کون

رگ و پے میں مری سمایا ہے کون
یہ بے خواب آنکھوں کو بھایا ہے کون

لہو میرا گردش میں آنے لگا
وہ چہرے سے پردہ اٹھانے لگا

وہ اشکوں کے دیپک جلانے لگا
مجھے دیکھ کر مسکرانے لگا

یہ حاصل ہے ساقی کو اپنے مقام
کیا پارسائی کو اس نے حرام

جو رندوں کے ہاتھوں میں رقصاں ہے جام
تو ہر شخص لگتا ہے اپنا امام

اٹھایا جو مطرب نے سازِ غزل
تو کھلنے لگے ہیں دلوں کے کنول

جو ساقی لگا ایک مردِ خلیل
تو منظر بھی تھا میکدے کا جمیل

وہ رندوں کا تھا میکدے میں وکیل
مرے پاس ہے بس یہی اک دلیل

ہمیں شعر آکر سناؤ کبھی
کہ اقبال و غالب کو لاؤ کبھی

مرے دَور کے زخم کھاؤ کبھی
کہ جی کر یہاں پر دکھاؤ کبھی

نگاہوں میں کوئی سماتا نہیں
نظر کو میری کوئی بھاتا نہیں

تصوّر ترا دل میں آتا نہیں
جو آجائے' دل سے وہ جاتا نہیں

تمدن کی دیوی پہ شیدا ہوئے
مُقامِ محبت ہویدا ہوئے

جو باہوں میں میری بکھرنے لگی
جھجک کر کبھی بات کرنے لگی

کبھی یاد بن کر ابھرنے لگی
وہ آنکھوں سے دل میں اترنے لگی

جو احساس میں لو دہکتی رہی
تو پیالے سے مے بھی چھلکتی رہی

جو آنکھیں نشے میں جھپکتی رہیں
تو شبنم پہ کرنیں تھرکتی رہیں

بہاروں کے پاؤں میں زنجیر ہے
گلوں کی یہی آج تقدیر ہے

کہ دستِ خزاں میں جو تصویر ہے
وہ بے رنگ و بو آج تنویر ہے

جو لُٹنے کی خود اپنی تدبیر ہے
تو دیوار و دل پر یہ تحریر ہے

تری یاد غم کو بڑھاتی رہی
وہ خوابیدہ ارماں جگاتی رہی

جو خوشبو بدن سے بھی آتی رہی
مرے سانس کو وہ گھٹاتی رہی

غریبوں میں اب زندگانی کہاں
میسّر انہیں شادمانی کہاں
وہ راتیں ہماری سہانی کہاں
گلوں میں بہارِ جوانی کہاں

ہر اک نقشِ باطل مٹاتے چلو
ز ہر ذرّہ طوفاں اٹھاتے چلو
یہ دارِ فنا ہے بتاتے چلو
سرِ دار بھی دندناتے چلو

فلک پر درخشاں ستاروں کو دیکھ
بہ طوفان اپنے کناروں کو دیکھ
تُو دورِ خزاں میں بہاروں کو دیکھ
تُو ویراں چمن میں نظاروں کو دیکھ

دھواں دل کا ذہنوں پہ چھاتا رہا
امیدوں کا دیپک بجھاتا رہا
میں شعلوں سے دامن بچاتا رہا
میں دوزخ کی دیوار ڈھاتا رہا

مجھے راس آئے ہیں دار و رسن
جنوں میں ہے رقصاں گل پیرہن

لگے ہم قفس کے جو زخمی بدن
تو تازہ لگی آج رسم کہن

غم زندگی کو نبھانا پڑا
اور آہوں کو اپنی دبانا پڑا

حقیقت سے پردہ اٹھانا پڑا
انا کا لہو ہے بہانا پڑا

رہی خنجر بن کر جو لغزش مری
کہاں کام آئی ہے کاوش مری

مخالف تھی اپنی ہی سازش مری
ہوئی مسترد دیکھ نالش مری

یہ شعورِ جنوں ہے مجھے کیوں عزیز
کہ جذبات رہتے ہیں بن کر کنیز

سحر کو بھی روکا ترے واسطے
یہ احساں اٹھایا ترے واسطے

غزل میری گا کر سناؤ مجھے
کبھی اپنی محفل میں لاؤ مجھے

نہیں ہے کسی کو طریقت سے کام
ہے نوکِ زباں پر شریعت کا نام

طریقت ہے انسانیت کا لباس
ہے دونوں جہاں کی شریعت اساس

جسے عشق کا اپنے اقرار ہے
وہ سانسوں میں غم کا طلبگار ہے
جو خواہش میں اپنی گرفتار ہے
وہ اپنے ہی رستے میں دیوار ہے

جو چاک گریباں کو سینا پڑا
لہو اوک سے اپنا پینا پڑا
جو اشکوں کے سانچوں میں ڈھلنا پڑا
تو مر مر کے ہر بار جینا پڑا

جو حکمت میں رکھتے ہیں اونچا مقام
خلوص و وفا سے وہ رکھتے ہیں کام
سَحر کی جو باہوں میں رہتی ہے رات
تو کسی کی بنی ہے زمانے میں بات

کوئی سوز و غم کا جو حامل نہیں
تو سینے میں اس کے کوئی دل نہیں
جہاں جام و مینا کی محفل نہیں
وہاں ساقی و رند شامل نہیں

ہے جب سے مرے لب پہ رقصاں غزل
کھلے آنکھ میں چاندنی کے کنول
یہاں مرحلہ کوئی آساں نہیں
کسی درد کا کوئی درماں نہیں

جو جینے کا دنیا میں ارماں نہیں
کسی اشک میں کوئی طوفاں نہیں

جو اک اشک پلکوں پہ لایا گیا
تو دیپک لہو سے جلایا گیا

ہر اک درد دل میں چھپایا گیا
ہے سینے میں طوفاں دبایا گیا

سنا ہے کہ مکّہ میں کوئی چلی
ہے دشمن کی بنل اس سے پھولی پھلی

خبر تھی یہ اخبار میں دلخراش
مسلماں سے غلطی ہوئی کیسی فاش

بدن پر مسلماں کے احرام تھا
غم آگیں مسلماں سرِ شام تھا

خبر یہ زمانے میں اب عام ہے
مدینے کی گلیوں میں کہرام ہے

ہوئی تنگ جب سے عرب کی زمیں
ہے رنگین خوں سے ہماری جبیں

جو مِلّت ہماری پریشان ہے
تو ہر کلمہ گو آج حیران ہے

جو دورانِ حج تھی قیامت بپا
حسابِ مروّت اجل نے لیا

سروں پر چلی گولیاں بار بار
سنائی نہ دیتی تھی چیخ اور پکار
عزیز و اقارب کو لاشیں ملیں
غموں سے ہماری زبانیں سلیں
جو مسلم ممالک سے آئے تھے لوگ
مناتے تھے اپنی ہی میّت پہ سوگ
نہیں میتوّں کا جہاں میں شمار
وہاں کیسے گزرے ہیں لیل و نہار
ہر اک سمت لوگوں کی تھی جو قطار
تو آنکھوں میں تھی خون ہی خوں کی دھار
جو حج کے زمانے میں ذلّت ہوئی
تو رسوا زمانے میں مِلّت ہوئی
عرب کی زمیں پر ہوا قتلِ عام
نہ دی اپنے جذبوں کو ہم نے لگام
مسلماں زمانے میں رُسوا ہوا
ضلالت کا گھر گھر ہے چرچا ہوا
نہ برپا ہوا ایسا محشر کبھی
فلک نے نہ دیکھا یہ منظر کبھی
جو شیدا خدا کے تھے زخموں سے چور
نکل آئے اپنی لحد سے حضورؐ

فلک پر فرشتے بھی بے چین تھے
مدینے کے رستے بھی بے چین تھے

نواسہ محمدؐ کا حیران تھا
علیؑ کا گھرانہ پریشان تھا

جو روندے گئے لوگ واں پاؤں میں
ہوا ان کا ماتم نہ اب گاؤں میں

بنی کربلا پھر زمینِ عرب
ہے رنگین خوں سے جبینِ عرب

میسر نہ ہو جس کو دو گز زمیں
تو اس کا وطن کیا کہاں کا مکیں

کہ سُنّی شیعہ کو نہ دو کوئی دوش
لڑانے کو دشمن دلاتا ہے جوش

خدا و جدا میں بڑا فرق ہے
کہ نکتے میں کون و مکاں غرق ہے

نہ لو اپنے بھائی سے تم انتقام
محمدؐ پہ بھیجو درود و سلام

یہ پھیلا ہے کیوں آج خوف و ہراس
نہ تھا ان میں کوئی بھی مردم شناس

ہے باعث ہمارے بھرم کا جو جج
ہمیشہ رہے گا ہمارا وہ جج

بہت مہرباں ہیں خدا و رسولؐ
انہوں نے دیئے ہیں جہاں کو اصول

جو حضرت عمرؓ نے کیا ہے سفر
وہ عدل و محبّت کی لائے سحر

ابوبکرؓ ، عثماںؓ ، عمرؓ اور علیؓ
ہے اُمتّ کی تقدیر ان سے بنی

ہے معراج تو ان کا ادنیٰ کمال
جو ٹھہرے حبیبِ شہِ لازوال

جو رکھتا نہیں ہے نظر میں حدیث
خدا کی نظر میں وہ ٹھہرا خبیث

ہے کعبہ مسلماں کی آنکھوں کا نور
کہ ملتا ہے اس سے دلوں کو سرور

مدینہ و مکّہ کے مالک ہو تم
ابد شاہراہوں کے سالک ہو تم

رسولِؐ خدا کا کرو احترام
محبّت کا لو اپنے ہاتھوں میں جام

کدورت سے، نفرت سے روکو انہیں
نہ پیکار میں یونہی جھونکو انہیں

جو جنگ و جدل کا ہے مرکز خلیج
نہ پنپے گا دھرتی پہ انساں کا بیج

ہوا قوم کو جنگ کا جو مراق
تو گردش میں رہنے لگا ہے عراق

کہاں سو گئے مصر و ایران و شام
کرو اب سعودی عرب سے کلام

بچانا اگر ہے امارات کو
زباں پر نہ لاؤ سوالات کو

اچھالو فضا میں نہ اپنا لہو
کرو صلح کی پیار سے جستجو

سنبھالیں گے کعبہ کی جب باگ ڈور
تو دنیا میں ہوگا مسلماں کا زور

یہ دورِ خزاں بھی گزر جائے گا
لہو کا یہ دریا اتر جائے گا

ہے مکہ میں گزرا جو اک حادثہ
وہ ہے ایک عبرت فزا سانحہ

لہو آنکھ سے ہے ٹپکنے لگا
ہے دامن زمانہ جھٹکنے لگا

کرو خود میں پیدا اگر اعتماد
تو آپس میں ہوگا جبھی اتحاد

سفارت نہ آئی کسی کے بھی کام
یہ کیسے ہیں ملکوں کے نام اور پیام

سُپر طاقتوں کی تجارت ہے یہ
بلا کی یہ حکمت، سیاست ہے یہ

اماں چاہئے جنگ کے واسطے
لہو چاہئے رنگ کے واسطے

لڑاتے ہیں ملکوں کو آپس میں یہ
چنگاری لگا دیتے ہیں خس میں یہ

دکھاتے ہی رہتے ہیں تیور غنیم
ہوئے جنگ میں کتنے بچّے یتیم

شب و روز لاشیں اٹھاتے ہیں لوگ
مزاروں پہ دیپک جلاتے ہیں لوگ

مُیسّر ہے کس کس کو کافور و مُشک
ہیں آنسو تلک اب تو آنکھوں میں خُشک

تماشائی ہیں کب سے روس اور فرانس
کہ ملتا ہے ان کو لڑانے کا چانس

جو خاموش لگتا ہے ہسپانیہ
نہیں چاہتاہ جنگ برطانیہ

بدلنے کو کروٹ ہیں چینی عوام
نیا لا رہے ہیں وطن میں نظام

ہٹانے سے پیچھے وہ ہٹتے نہیں
وہ بادل کی مانند چھٹتے نہیں

سمجھتا ہے کیا سورما خود کو ہند
نہ مارے گا پر اس کا کوئی پرند

ہے آمر کا جب سے اٹھا بوریا
ترقی کے رستے پہ ہے بوریا

نہیں کوئی بے لاگ دنیا میں آج
ہے شعلہ فشاں آگ دنیا میں آج

ہر اک ملک دنیا کا ہے جبّہ دار
سیاست کا عیّاری پر ہے مدار

نہیں دیتی ملکوں کو یہ بات زیب
کہ دیتے رہیں دوسروں کو فریب

ہے کالوں میں گوروں میں کیوں کشمکش
مذاہب کے ناموں پہ ہے چپقلش

یہ پس ماندہ ملکوں کا احوال ہے
کہ غیروں کے ہاتھوں میں سب مال ہے

سیاست میں چلتے ہیں وہ ایسی چال
ہے چُنگل سے ان کے نکلنا محال

نہ عزّت کی پروا نہ جینے کا جوش
نہیں ہے کسی بات کا ان کو ہوش

کھلونا ہیں صنعت کے ہاتھوں میں وہ
گرفتارِ بدعت کے ہاتھوں میں وہ

ہمیں دیتے ہیں سوشلسٹ جو قرار
ہمیشہ خدا کی پڑے ان پہ مار

جو علمائے سوء نے کیا ہے خراب
تو نازل ہوا ہے خدا کا عذاب

ہے علمائے سوء نے کیا جب تباہ
تو کس سے کرے کوئی آخر نباہ

جو علمائے حق ہیں مرے پیشوا
انہوں نے مجھے درسِ حق ہی دیا

یہ علمائے سوء بہرِ اُمّت امام
ہیں معصوم روحوں کے قاتل تمام

قیادت ہے ان کی بڑی بے نظیر
جو ترکش میں رکھتے ہیں جاں لیوا تیر

ہے دانشوروں کا یہ اپنے خیال
ہُنر سے ہی ملتا ہے سب کو کمال

جو اقبال و مہدی میں تھا سوز و ساز
تو کھولے انہوں نے اُخوّت کے راز

جو تامل سنہالی ہیں اپنے خلاف
تو جے وردنے[1] نے ہے کی بات صاف

---

[1] جے وردھنے -- سابقہ صدر سری لنکا

جو حالیؔ و سیدؔ تھے لاؤ انہیں
شریعت کا بل پھر دکھاؤ انہیں
نہیں پاؤں کے نیچے اپنے زمیں
کہاں خطۂ پاک میں ہم مکیں

ہمیں مارا اسکندرؔ[1] ایوبؔ[2] نے
ہے لوٹا ہمیں اپنے محبوب نے
وطن کو نہ راس آئی جمہوریت
ہے معلوم اس کی بنی ہے جو گت

نہیں اپنی محفل میں لیبیا و شام
خیالات لگتے ہیں ہم سب کے خام
ہے جب سے اڑی خاک لبنان کی
تڑپنے لگی روح جبرانؔ[3] کی

ہیں نوکِ قلم جو سیاہی فشاں
تو ہر سمت چھائی ہیں تاریکیاں
ہے علم و ہنر میں جو مرعوبیت
تو چھائی ہے ذہنوں پہ صیہونیت

1۔ جنرل سکندر مرزا سابقہ صدر پاکستان

2۔ جنرل ایوب خان سابقہ صدر پاکستان

3۔ جبران خلیل جبران

کہاں ہیں ہمارے وہ مولائے رومؒ[۱]
کہ جن کی زمانے میں تھی ایک دھوم

زمانے میں اپنی ہے پُرسش کہاں
بدلنے کی خود کو ہے کوشش کہاں

جو حالیؒ[۲] نے اپنی مسدس لکھی
تو ملّت کی اس میں کہانی لکھی

حکومت پہ قائدؒ[۳] نے فائز کیا
خراج اس پہ خوں سے ہے ہم نے لیا

ہے جاپان صنعت پہ چھایا ہوا
ہر اک چیز پر اس کا سایہ ہوا

ہے لوگوں سے ڈرنے لگی خود اجل
بنے لوگ جب سے ہیں اس کا بدل

جو آیا ہے حق کا لبوں پر سوال
تو شاہوں کا ہونے لگا ہے زوال

اچھالے ہیں لوگوں نے اب تخت و تاج
نہ ہوگا کسی کا کسی پر بھی راج

۱۔ مولانا جلال الدین رومی

۲۔ مولانا الطاف حسین حالی

۳۔ قائداعظم محمد علی جناح

جو ہے مرنے جینے کی آماجگاہ
وہ حسرت کی لگتی ہے قربان گاہ

جو رنج و الم میں رہا عمر بھر
جھکایا نہ اس نے کہیں پہ بھی سر

ہجومِ تمنا نے گھیرا مجھے
کہاں پر ملے گا سویرا مجھے

پڑی اپنی اُمت ہے ورطوں میں آج
بٹی اپنے ہاتھوں ہے فرقوں میں آج

اڑی دھجیاں جب سے دستور کی
سُنے کون دنیا میں مجبور کی

خدا ایک، قرآن، سُنت ہے ایک
ہو ایمان جس میں وہ اُمت ہے ایک

جو علماء کے ہاتھوں لٹے ہیں عوام
تو جمہوریت کا کہاں ہو قیام

تمہارے لہو میں ہے فتنوں کا پھیر
مرے سامنے تم ہو مٹی کا ڈھیر

شب و روز تم نے پیا ہے لہو
رہی لُوٹنے کی سدا جستجو

لکھی میں نے جور و ستم کی کتاب
تمہیں اب تو دنیا پڑے گا حساب

جو ویراں کیا تم نے گھر بار کو
تو بستر بناتے رہے دار کو
جو نام محمدؐ پہ لٹتے رہے
وہ ہر روز ہستی میں چھٹتے رہے

ہے مُردوں سے لوٹا جو تم نے کفن
بنے فی الحقیقت ہو تم گورکن
غریبوں سے تم نے لیا ہے خراج
غریبوں کے سر پر ہے کانٹوں کا تاج

غریبوں کی جیبوں پہ تم بوجھ ہو
شریفوں کی جانوں پہ تم بوجھ ہو
تم انساں نہیں بلکہ شیطان ہو
بہ شکلِ بشر عین حیوان ہو

تمہیں کس نے انساں دیا ہے قرار
حقائق سے لگتا ہے یہ تو فرار
چکائیں گے ہم تم سے اپنا حساب
رکھیں گے سدا مبتلائے عذاب

جو منبر پر کرتے ہیں باتیں فضول
انہیں دیکھتا ہے خدا کا رسول
ہیں باتیں زباں پر تو وجدان کی
مگر پیروی ہے تو شیطان کی

نہیں فرق مُلّا و شیطان میں
بدلتا ہے رخ اپنا ہر آن میں
حقائق سے پردہ اٹھاتے چلو
لعینوں کا چہرہ دکھاتے چلو

لٹیرا ہمارا نگہبان ہے
جبھی انکی سانوں میں ہر جان ہے
رہا مارشل لاء ہمیشہ جہاں
وہاں زندگی کا گزر ہو کہاں

جو مفلس نوالوں سے محروم ہیں
وہ مفلس اجالوں سے محروم ہیں
یہ بہتر ہے سی دو ہماری زباں
نہ ہوگی زباں سے حقیقت بیاں

حرم والوں سے تم حرم چھین لو
ہر اہلِ قلم سے قلم چھین لو
نہ روکے رکے گا یہ سیل رواں
کہ جذبے غریبوں کے ہیں اب جواں

سروں پہ رہے تم ہمیشہ سوار
چکانا پڑے گا تمہیں یہ ادھار
تمنا کے گلشن جلائے بہت
ہیں رستے میں کانٹے بچھائے بہت

جو جینے کا ہونے لگا ہے شعور
نہ باقی رہے گا تمہارا غرور
محافظ مُحبّت پہ ڈٹ جائیں گے
یہ بادل کدورت کے چھٹ جائیں گے

نگاہیں ملانا بھی ہوں گی محال
تواریخ میں یہ رہے گی مثال
اٹھایا ہے پرچم بغاوت کا اب
اٹھائیں گے مل کر قدم اپنا سب

نہ کھولو مری زندگی کی کتاب
کہ دینا پڑے گا مجھے بھی جواب
یہ بہتر ہے مجھ سے نہ مانگو حساب
میں پیتا ہوں اپنے لہو کی شراب

جو کھولوں گا لوگوں کی قسمت کا باب
کہاں میں کہاں پھر تمہارا عتاب
جو نعرہ زباں پر ہے تکبیر کا
رہیں گے وہ باطل سے تیغ آزما

شہیدوں کی لاشیں اٹھانے نہ دو
کوئی قبر ان کی بنانے نہ دو
لہو بن کے جو اشک نکلا ہے آج
فلک سے پلک کے وہ ٹپکا ہے آج

نہیں ہے مسلماں میں علمِ کلام
کہاں سے میں لاؤں غزالی کا کام
جو منطق میں رکھتا ہے اونچا مقام
وہ ہے سی۔ اے۔ قادرؒ[1] ہمارا امام

محبّت جتانے سے کیوں عار ہے
ادیبوں سے جبکہ تمہیں پیار ہے
شجر ہوں سرِ رہ مجھے کاٹ لو
مجھے پتھروں سے کبھی چھاٹ لو

میں بستا ہوں شیشہ نما شہر میں
میں صفدر ہوں تنہا بھرے دہر میں
قلم کی جگہ ہاتھ خنجر ہوا
ہے میرا ہی دشمن مرے گھر ہوا

جو پستی زمیں کی مرے در پہ ہے
فلک مہرباں کیوں مرے سر پہ ہے
ہلایا سکندر نے بنیاد کو
نہ آنے دیا لب پہ فریاد کو

کیا جس نے پامال آئین کو
کیا ذبح پھر اس نے شاہین کو

---

1. ڈاکٹر سی۔ اے۔ قادر مرحوم

ترقّی پسندوں کا بیڑہ ہے غرق
کہ آیا ہے اب ان کے موقف میں فرق

جو سیما بدن ہے ہنر درکنار
ہے لگتی مجھے وہ ڈرامہ نگار

نہیں ہے یہاں پر کوئی حق شناس
نہیں ہے مُروّت کے پھولوں میں باس

فضائے مکدّر میں اپنی نہ گھُوم
کہ چلتی ہے ہر گھر میں باد سمُوم

کہیں پر ملے گی نہ مانگے سے بھیک
قناعت کی باتیں ضمیروں میں ٹھیک

زمانہ بنا سب کا شیشہ باز
ہے دنیا و دیں کا فسانہ دراز

عدالت ہو لونڈی جہاں ملک میں
تو انصاف ہوگا کہاں ملک میں

وکیلوں کے حالات پوچھو نہ تم
دلائل کی بارات دیکھو نہ تم

جو یحییٰ[۱] نے رسوا کیا فوج کو
تو دریا سے خارج کیا موج کو

۱۔ جنرل یحییٰ خاں مرحوم سابقہ صدر پاکستان

کہاں ہم زمانے میں آزاد ہیں
بے آئین دنیا میں آباد ہیں

چمن میں کوئی اپنا محرم نہیں
کوئی پھول پتوں پہ شبنم نہیں

جو نانِ شبینہ سے محروم ہیں
وجود ان کے دنیا سے معدوم ہیں

مرے پاس لڑنے کی قوت نہیں
وہ سینے میں جوش شجاعت نہیں

ہمارے زمانے کے غازی ہیں یہ
مساجد میں اپنی نمازی ہیں یہ

جو بھٹو[1] حکومت پہ فائز ہوا
ہر اک شے کو اس نے منظم کیا

ہوا مارشل لاء کا جو منتظم
تو کرنی پڑی سر اسے ہر مہم

جو اس نے کرائے یہاں انتخاب
رفیقوں نے اس کو کیا آب آب

ہوا ملک میں ایسا محشر بپا
سیاست نے ہم سب کو رسوا کیا

1۔ ذوالفقار علی بھٹو سابقہ وزیراعظم پاکستان

بصیرت کے لوگوں نے توڑے جو ساز
ہوا مارشل لاء کا پیدا جواز
پڑی تھی تعصّب کی آنکھوں پہ خاک
تھا عقل و بصیرت کا دامن بھی چاک

بنا تھا جو آقا یہاں پہ غلام
دیا زہر کا اس نے آقا کو جام
لحد میں اسے جب اتارا گیا
تو مٹّی نے اس کو سہارا دیا

تھیں ماتم کناں اس پہ تاریکیاں
فضا میں ہوا کی تھی کچھ ہچکیاں
جو نسلی حکومت کا معتوب تھا
وہی بنجمن[1] آج مصلوب تھا

جو تھا فوج کا اپنی جرنل ضیاء[2]
حکومت پہ اس نے ہی قبضہ کیا
جہاں مارشل لاء کو نافذ کیا
قساوت نے رک کر وہاں دم لیا

1۔ جنوبی افریقہ کا انقلابی شاعر بنجمن مالس نے تحریک آزادی میں حصہ لینے کے جرم میں نسل پرست حکومت نے سزائے موت دی۔

2۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم سابقہ صدر پاکستان

جو آئین کو اس نے باطل کیا
خراج اس نے لوگوں سے گھر گھر لیا

جو آئین میں اس نے ترمیم کی
تو پھر سے حکومت کی تنظیم کی

جسے لوگ کہتے ہیں جرنل ضیاء
اجالوں میں اس نے اندھیرا کیا

لبوں پر تھا نام اس کے اسلام کا
پہ تھا منتظر اس کے انجام کا

ہے میری نظر میں جو جرنل ضیاء
نظامِ زکوٰۃ اس نے قائم کیا

پڑھی جس نے دنیا میں دل سے نماز
خدا کی نظر میں ہے وہ سرفراز

نہ لوٹائی جس نے امانت یہاں
قیامت میں اس کی ہے بخشش کہاں

ہوں کیسے وطن کے حقائق رقم
قلم کے بدن میں نہیں کوئی دم

نہیں ملک میں اب مہاجر کوئی
رہے گا نہ دنیا میں آجر کوئی

نہ پہنچی ہے مشرق میں جمہوریت
ہے مغرب میں حاصل اسے اہمیت

فلک بوس مُلّا کی دستار ہے
تو شعلہ فشاں اس کی گفتار ہے
مزاج اپنا ڈیموکریٹک نہیں
طریق اپنا بھی سوشولسٹک نہیں

بروہی۱؎ لگا ہے مجھے خود پرست
وہ شہرت کی دنیا میں رہتا ہے مست
سیاست کو حکمت میں لایا ہے وہ
دماغوں پہ لوگوں کے چھایا ہے وہ

جو آمر کو ہم پر مسلط کیا
تو اس کو حکومت میں منصب ملا
کسی کو وہ خاطر میں لاتا نہیں
وہ سر پر کسی کو بٹھاتا نہیں

وہ جب برسرِ اقتدار آگیا
تو آنکھوں میں اس کی خمار آگیا
اشارے پہ اس کے جو گولی چلی
وہیں آگ نفرت کی جلنے لگی

جو بات اس میں پہلے تھی وہ اب نہیں
یہ اک آمریّت ہے مذہب نہیں

۱؎ اے۔ کے۔ بروہی پاکستان کے نامور قانون داں

جو ملّت کا ہر طرح مخدوم ہے
جونیجو[1] سیاست میں معصوم ہے
بلندی پہ ٹھہرا تھا جب مارکوس[2]
ہے پستی کی دنیا میں اب مارکوس

جو رکھتا تھا سر پر فلک بوس تاج
ہے لوگوں کے پیروں میں سر اس کا آج
نظر میں تھا جس کی فقط سیم و زر
اکینو[3] نے اس کا جھکایا تھا سر

بنایا تھا لوگوں نے جو بنگلہ دیش
بِنائے غلط پر رہا ان کا کیش
ہے برسوں سے میری نظر میں مجیب[4]
وہ فکر و نظر میں لگا ہے عجیب

ضیاء[5] نے لیا جس سے خود اقتدار
نہ راس آئی اس کو وطن کی بہار

1۔ محمد خان جونیجو سابقہ وزیراعظم پاکستان

2۔ مارکوس سابقہ صدر فلپائن

3۔ مسز اکینو صدر فلپائن

4۔ جنرل مجیب الرحمٰن مرحوم سابقہ صدر بنگلہ دیش۔

5۔ جنرل ضیاء الرحمٰن مرحوم سابقہ صدر بنگلہ دیش۔

حکومت بنائی جو رحمٰن[1] نے
کیا قتل پھر اس کو انسان نے

کہاں تک وطن میں وہ مقبول تھے
یہ دونوں ہی قاتل و مقتول تھے

ضیاؤں میں ظلمت پنپتی رہی
کرن نفرتوں کی چمکتی رہی

جو آیا یہاں برسر اقتدار
وہ ارشاد[2] تھا جس نے لوٹی بہار

جو لوگوں نے کرسی پہ مارا اسے
گریباں پکڑ کر اتارا اسے

جو لوگوں نے چھینیں ہیں اپنے حقوق
ہوا ان کو حاصل جہاں میں وثوق

نہیں کوئی محروم حق سے جہاں
ملی خالدہ[3] کو حکومت وہاں

خمینی[4] ہی لایا ہے وہ انقلاب
نہیں جس کا دنیا میں کوئی جواب

1۔ جنرل ضیاء الرحمٰن مرحوم سابقہ صدر بنگلہ دیش۔

2۔ جنرل محمد ارشاد سابقہ صدر بنگلہ دیش۔

3۔ بیگم خالدہ ضیاء وزیراعظم بنگلہ دیش۔

4۔ حضرت آیت اللہ خمینی روحانی پیشوا ایران

مسلماں کو جو درس جنت دیا
ہے دشمن کو بھی درس عبرت دیا
کسی سے زمانے میں دبتا نہیں
کسی حال پیچھے وہ ہٹتا نہیں

سپر طاقتوں نے کیا ہے ذلیل
یہ نمٹے گا ان سے مردِ خلیل
وہ چھا کر رہے گا زمانے پہ اب
کہ آئے گا انساں ٹھکانے پہ اب

خمینی کا پہنچے گا نعرہ جہاں
نہ ہوگا کسی بادشاہ کا نشاں
نہ آئے گا دورِ غلامی کبھی
کہ ہادیء کامل ہے اپنا نبیؐ

ہیں شیرِ خدا جو ہمارے علیؓ
ہے رسمِ وفا ان کے خوں سے چلی
جنیوا نہیں امن کی سرزمیں
کہ رنگیں ہے قوموں کی خوں سے جبیں

اچھالا ہے تم نے ہی ان کا لہو
رکھیں دل میں جینے کی جو آرزو

خمینیؒ[1] سے سیکھے گی دنیا اصول
وہ اپنے گلستاں کا رنگین پھول

جو جینا ہے دنیا میں انسان کو
لگائے وہ سینے سے قرآن کو

جو مر مر کے جینے کا نسخہ دیا
اندھیروں میں اس نے اجالا کیا

نظر میں رہے ہیں ہمارے شہید
کہاں کی خوشی اور کہاں کی تھی عید

جو ایراں کی تاریخ رنگین ہے
ہر اک واقعہ اس کا سنگین ہے

جو دینِ محمدؐ سے محکم اساس
خمینی نے اس سے کیا روشناس

ہر اک چیز اس کے تصرّف میں ہے
زمانہ ابھی کچھ توقّف میں ہے

نہ کرتا کسی پر کبھی انحصار
ہو ناموس و عزت پہ دل سے نثار

خمینیؒ نے درسِ اُخوّت دیا
فرائض سے سب کو شناسا کیا

۱۔ حضرت امام خمینیؒ

جہاں طاعت صبحگاہی نہیں
کبھی راس واں خانقاہی نہیں
ہمارے لہو میں ہیں دیر و کنشت
مُقدّر میں اپنے کہاں ہے بہشت

سُپر طاقتوں کے نہ ہوتا اسیر
یہ نسخہ تحفّظ کا ہے ناگزیر
جو بیت المقدّس پہ قابض ہیں اب
انہیں ہم وہاں سے نکالیں گے کب

یہ تاریخ لگتی ہے گرچہ قدیم
نہ بھولا کوئی پہلی جنگ عظیم
دیا جنگ دوئم نے ہم کو سبق
پلٹنے کو ہیں پھر سے رنگیں ورق

نئی جنگ سوئم کا ہے سامنا
بڑھیں وہ جو چاہیں اسے تھامنا
دیا ہم کو قائد[1] نے ایسا سبق
کہ ہے یاد اس کا ورق پر ورق

کیا سب کو بیدار اقبال[2] نے
سمجھائے ہیں کرتب اسی زال نے

---

1. قائداعظم محمد علی جناح

2. علامہ اقبال

تھے خاموش شاعر جو ملتان میں
وہ پختہ رہے اپنے ایمان میں

شیخ بشیر احمد خان خاموش

عرب و پاک و ہند کے نمائندہ شاعروں ادیبوں اور صوفیائے کرام کے بنیادی خیالات و افکار کی مختصر تصویریں

عرب کا ہے دیوان پیشِ نظر
ملی شاعروں کی اسی سے خبر

جو عربی ادب میں ملی شاعری
محاسن کی اس میں ہے جلوہ گری

جو عربی ادب میں تھا منظر نگار
وہ تھا قیس[۱] فطرت کا اک شاہکار

دکھائے تھے جس نے وہ فنی کمال
نہ ہوگا ادب میں وہ روبہ زوال

دکھایا تھا جس نے ادب میں کمال
نہ ہوگا اسے شاعری میں زوال

۱۔ امرؤ القیس بن حجر بن عمر الکندی (المتوفی 560ء یا 540ء) اس کی شاعری [illegible]

اس کا کلام جدت الفاظ اور اوج تخیل کی صفات سے متصف ہے۔

جو آیا نظر شاعری میں جمال
وہ تھا نابغہ[1] کے ہنر کا کمال
متمم[2] کا تھا مرثیے میں مقام
غموں کی جو اس نے دکھائی تھی شام
حماسہ ہے بن اوس[3] کا شاہکار
نظر اس میں آیا عرب کا وقار
جو تھی شاعری بزم آرا وہاں
رہی تھی وہی رزم آرا وہاں
قصیدے میں تھی علقمہ[4] کی جو شان
وہ قابو میں رکھتا تھا اپنی زبان
قصیدہ تھا جو عمر[5] کا لاجواب
نظر اس میں آیا قلم کا شباب

1۔ النابغہ الذبیانی (المتوفی 604ء) نابغہ کا اصلی نام زیاد بن معاویہ تھا۔ نابغہ کا شمار اصحاب معلقات میں بھی ہوتا ہے۔

2۔ متمم بن نویرہ جو مرثیہ نگاروں کی صف اول میں شامل ہے۔

3۔ ابو تمام حبیب بن اوس (المتوفی 231ھ) جس کے ہاتھوں "حماسہ" کی تدوین ہوئی۔ حماسہ ایام جاہلیت میں ناموس قومی کے معیار اور اقدار کا احاطہ کرتی ہے وہ عظیم شعراء میں سے ایک تھا۔

4۔ علقمہ بن عبدۃ التمیمی (المتوفی 561ء) اس کے قصائد اوج تخیل کے لئے ممتاز ہیں۔

5۔ عمرو بن کلثوم (المتوفی [illegible])

تھا عنترہ[1] کا رومان پرور کلام
پڑھا جائے گا وہ بصد احترام
جو تھا کعب[2] بھی شاعری میں عظیم
رہا زندگی میں وہ اپنی حلیم

جو حسان[3] نعتوں میں اکمل رہا
وہ حمد و ثناء میں بھی افضل رہا
جو خنسا[4] کے اشعار نشتر بنے
فلک پر وہ زخموں کے اختر بنے

جو اظہار میں اپنے اکمل رہی
وہ نوحہ گری میں بھی افضل رہی
تھی اخطل[5] کی نظموں میں دوشیزگی
نظر ان میں آئی تھی پاکیزگی

فرزدق[6] قصیدے میں تھا جو فریق
تو الفاظ و معنی میں تھا وہ دقیق

1۔ عنترہ بن شداد العبسی (المتوفی 615ء) یہ شاعر رومان تھا۔

2۔ کعب بن زہیر بن ابی سلمیٰ

3۔ ابو ولید حسان بن ثابت الانصاری (مادح رسولؐ اللہ)

4۔ الخنساء اس کے مرثیے درد و غم سے پر ہیں۔

5۔ ابو مالک غیاث الاخطل بن غوث التغلبی النصرانی

6۔ نام ابن غالب بن صعصعہ الفرزدق (المتوفی 110ھ)

رہا ہجو میں جو نمایاں جریر[1]
نہ ملتی تھی اس کی کہیں پر نظیر

جو باریکیوں پر تھی فن کی نظر
کمیتی[2] قصائد میں تھا کیا اثر

ہماری نظر میں جو آزاد[3] تھا
نئی شاعری کا وہ فرہاد تھا

فصاحت تھی شبلی[4] کی تالیف میں
کہوں گا میں کیا ان کی تعریف میں

جو ہے فارسی کا میسر کلام
گرامی[5] کا ہے اس میں اونچا مقام

یگانہ رہے شاعری میں سلیم[6]
وہ طرزِ سخن میں تھے اپنے قدیم

1۔ جریر بن عطیہ بن الخطفی التمیمی (المتوفی 729ء)

2۔ ابوالمثل الکمیت بن زید الاسدی الکوفی (المتوفی 744ء)

3۔ مولانا محمد حسین آزاد

4۔ مولانا شبلی نعمانی

5۔ مولانا شیخ غلام قادر گرامی

6۔ مولانا وحید الدین سلیم

جو ناول کا ٹھہرا ہے رسواؔ[1] ستون
حقیقت نگاری تھا اس کا جنون
جو شعر و ادب کا رہا ہے شعار
وہی حشرؔ[2] آغا ڈرامہ نگار
جو سیمابؔ[3] جدت کے حامی رہے
قلمرو میں اپنی وہ نامی رہے
ہے اعجاز وحشتؔ[4] کی تحریر میں
بلندی ہے لفظوں کی تصویر میں
جو فطرت کے کیفیؔ[5] رہے ترجمان
تو دلکش رہا ان کا طرزِ بیاں
ہے "جوگی" جو ناظرؔ[6] کا عمدہ کلام
تو نظموں میں پایا ہے اونچا مقام

1۔ مرزا محمد ہادی رسوا

2۔ آغا محمد شاہ حشر

3۔ عاشق حسین سیماب اکبر آبادی

4۔ رضا علی وحشت کلکتوی

5۔ پنڈت برجوہن دتاتریہ کیفی

6۔ چودہری خوشی محمد ناظر

سخن میں ہے اصغرؔ[1] کے حکمت بہت
ہے تحریر میں اس کی عظمت بہت

یگانہؔ[2] نے پایا وہ طرزِ کلام
کہ وادیِ فن میں ہے اپنا امام

جو ہے شاعری میں ہمارا ریاضؔ[3]
بغل میں وہ رکھتا ہے مے کی بیاض

ہے "تاجِ سخن" کا جو شاعر جلیلؔ[4]
ہے وہ سادگی میں خود اپنی دلیل

جو بیخودؔ[5] روایت کی تصویر ہے
تو آئینہ دار ان کی تحریر ہے

غزل کی ہی دنیا میں سائلؔ[6] رہے
وہ حسن و محبّت پہ مائل رہے

۱۔ اصغر حسین اصغر گونڈوی

۲۔ مرزا واجد حسین یاس یگانہ چنگیزی

۳۔ سید ریاض احمد ریاض

۴۔ جلیل حسن جلیل مانک پوری۔

۵۔ سید وحید الدین بیخود دہلوی

۶۔ نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی

رہے شاد[1] رنج و الم کا شکار
مسرت کی ان پر نہ آئی بہار
جو ثاقب[2] کی تھی شاعری پر نظر
وہ تھے میرؔ و غالب کے زیر اثر

وہ ناصر علی[3] تھا جو رنگیں زباں
حکیمانہ تھا اس کا طرز بیاں
سلیمان ندوی[4] تھے دانش کی شان
وہ علم و ادب کی رہے تھے زبان

جو کیفی[5] کی مجھ کو ملی "واردات"
تو اس میں ملیں اس کی ادبی صفات
جو خاکوں میں مجھ کو ملا ہے رشید[6]
وہ طرز بیاں میں ہے اپنے شدید

1۔ سید علی محمد شاد عظیم آبادی۔

2۔ مرزا ذاکر حسین قزلباش ثاقب لکھنوی

3۔ میر ناصر علی (دبستان دلی کا آخری معلم)

4۔ مولانا سید سلیمان ندوی

5۔ علامہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی

6۔ رشید احمد صدیقی

کھلے شاعری میں ہیں جس کے نصیب
کہانی میں چمکا ہے وہ عندلیب[1]

نہ تھا شاعری میں کوئی جس کی جل
وہ تھا آرزو[2] شاعرِ بے بدل

غزل میں ہے قوسِ قزح کا سا رنگ
اثر[3] نے کیا اس سے لوگوں کو رنگ

جگر[4] نے سنائی جو اپنی غزل
کِھلے اس سے محفل کے دل کے کنول

جو امجد[5] نے ڈالی رباعی میں جان
بڑھی اس سے اس کی زمانے میں شان

جو افسانے منٹو[6] کے ہیں یادگار
ملا ہے وہ ان میں بھی سینہ فگار

1۔ عندلیب شادانی

2۔ آرزو لکھنوی

3۔ مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی

4۔ جگر مرادآبادی

5۔ مولوی سید احمد حسین امجد حیدرآبادی

6۔ سعادت حسن منٹو

جو بیدی[1] ادب میں ہے افسانہ گر
لگا ہے کڑی دھوپ میں وہ شجر

جو ممتاز مفتی[2] نے سردار ہیں
کہانی میں وہ اس کے فنکار ہیں

دیوندر[3] کی دنیا رہی لوک گیت
کہانی میں رقصاں مُحبّت کی ریت

دکھائی جو سودا[4] نے فن کی بہار
قصیدے کا بن کر رہا ہو سنگھار

جو بنگال کا نذر الاسلام[5] ہے
ادب میں بھی اس کا بڑا نام ہے

جو آزاد[6] نامی گرامی ہوا
وہ اردو ادب کا بھی حامی ہوا

1۔ راجندر سنگھ بیدی۔

2۔ ممتاز مفتی۔ مشہور افسانہ نگار

3۔ دیوندر ستیارتھی

4۔ مرزا محمد رفیع سودا

5۔ نذر الاسلام (بنگال)

6۔ جگن ناتھ آزاد ہندوستان

جو آزاد کے ہے نظر میں کلام
ہے اردو ادب میں بھی اس کا مقام

دعاؤں پہ لوگوں کا ہے انحصار
اثر کا دعاؤں کی ہے انتظار

ازل سے یہاں روح مصلوب ہے
نجات اس کی آدم کو مطلوب ہے

تخلص تھا جس کا ادب میں صباؔ[1]
روایت میں تھا وہ غزل کی قبا

ادب میں تھی عصمتؔ[2] جو منزل شاہی
حقیقت نگاری تھا اس کا لباس

ہے منظر نگاری میں یکتا فراقؔ[3]
غزل کی بلندی پہ پہنچا فراق

جو اردو زباں کا ہے روشن چراغ
تخلص تھا اس کا زمانے میں داغؔ[4]

۱۔ حضرت صبا اکبر آبادی مرحوم کراچی

۲۔ عصمت چغتائی مرحومہ صاحب طرز افسانہ نگار

۳۔ فراق گورکھپوری

۴۔ نواب مرزا خاں داغ دہلوی

ہوا شاعری میں جو استاد ذوق[1]
وہ الفاظ و معنی میں تھا سب پہ فوق

فلک پہ جو قمر ہے وہ ہے ظفر[2]
غزل کی زمیں پہ تھی اس کی نظر

جو غالب[3] تھا صفدر وہ غالب رہا
وہ روح ادب کا بھی قالب رہا

مُیسّر ہے خوشحال کا جو کلام
روایات کا اس میں رقصاں ہے جام

ادب سے لیا جس نے خنجر کا کام
وہ خوشحال[4] تھا جس کا پشتو میں نام

شجاعت کی اس نے جو تلقین کی
قبائل کے ہاتھوں میں سنگین دی

جو مخلص تھے جذبوں میں بابا فریدؒ[5]
مُحبّت تھی لوگوں سے ان کو شدید

---

1. شیخ ابراہیم ذوق
2. بہادر شاہ ظفر
3. مرزا اسد اللہ خاں غالب
4. خوشحال خاں خٹک پشتو کا عظیم شاعر
5. حضرت فرید الدین مسعود گنج شکر 504ھ میں پیدا ہوئے۔ وفات [illegible] میں ہوئی۔

جو سلطان باہوؒ[1] ہے شاعر عظیم
ہے دیوان اس کا نہایت ضخیم

لکھیں کافیاں ایسی خواجہ فریدؒ[2]
کہے جن کو دنیا محبّت کی عید

طریقت میں تھے وہ زمانے کے پیر
دیئے پھر بھی جُہّل کے ہاتھوں میں تیر

مناتے ہیں سندھی بھی جشنِ لطیفؒ[3]
نہیں کوئی رونق میں اس کا حریف

بھٹائی نے جن کو دیا ہے شعور
وہ پاتے ہیں اس کے ادب سے سُرور

جو رحمانؒ[4] بابا نے لکھے ہیں گیت
نمایاں ہے ان میں محبّت کی ریت

جو ہے بابا طاہرؒ[5] رباعی کا شیر
وہ کرتا ہے دونوں جہانوں کو زیر

1۔ حضرت سلطان باہوؒ 1039ھ میں پیدا ہوئے۔

2۔ خواجہ غلام فرید 1845ء میں پیدا ہوئے۔ وفات 1921ء میں پائی۔

3۔ شاہ عبدالطیف بھٹائی

4۔ رحمان بابا

5۔ بابا طاہر

کچھ ایسا ہے بلھےؒ[1] کا شیریں کلام
کہ پڑھتے ہیں اس کو خواص و عوام

جو سچلؒ[2] ہے سرمست کیف شراب
وہ ہے سندھ کے دیس میں محو خواب

جو ہمدمؒ[3] ہے اقلیم فن کا دھنی
نہیں اس کا دنیا میں ہمسر کوئی

جو مخدومؒ[4] رہتا ہے ملتان میں
وہ درویش ہے اپنی ہر شان میں

بلندی پہ فن کی کھڑا ہے عزیزؒ[5]
سپہرِ بریں تک رسا ہے عزیز

جو بزمِ ادب کی تھا زینت عزیز
پئے شعر و فن وجہ عظمت عزیز

نظر میں بشارتؒ[6] کی ہیں سب علوم
ہے عمرانیّت میں بڑی ان کی دھوم

1۔ بابا بلھے شاہ (1680ء سے 1758ء)

2۔ حافظ عبدالوہاب سچل سرمست بن میاں صلاح الدین ولادت 1152ھ وفات 1243ھ

3۔ نور محمد ہمدم بلوچستان کے ممتاز شاعر

4۔ مخدوم محمد سجاد حسین قریشی سابقہ گورنر پنجاب۔

5۔ عزیز حاصل پوری مرحوم۔ نعت گو اور غزل گو شاعر

6۔ پاکستان کے مایہ ناز محقق ڈاکٹر ایم۔ بشارت علی مرحوم ماہر عمرانیات

نیا ہے جو نعتوں میں محسنؔ[1] کا رنگ
وہ جذبہ کہ جس سے ہے آئینہ سنگ

ہے "گورِ غریباں" وہ نظمِ[2] بلند
ستاروں پہ جو ڈالتی ہے کمند

رہے منفرد اپنے فن میں سلیمؔ[3]
ہوا طورِ افکار کا وہ کلیم

جو سرورؔ[4] مُفسّر ہے جذبات کا
مبصّر ہے فطرت کی عادات کا

جو محرومؔ[5] نے فکر کی ہے رقم
کہ بس توڑ کر رکھ دیا ہے قلم

ہے نادرؔ[6] کا اپنا اچھوتا کلام
وہ دیتے ہیں اپنی ادا میں پیام

1۔ محسن کاکوروی

2۔ نظم طباطبائی

3۔ وحید الدین سلیم

4۔ درگا سہائے سرور جہاں آبادی

5۔ تلوک چند محروم

6۔ منشی نادر علی خاں نادر کاکوروی

جو امجدؒ[1] کو طبعِ رسا ہے نصیب
تو اک جوہرِ بے بہا ہے نصیب

عمومی ہے شاکرؒ[2] کا رنگ کلام
وطن کی مُحبّت کا ہے جو پیام

کہ جس کا مورخ بھی ممنون ہے
وہ احسان گر ابنِ خلدون ہے

رواں جس کا سکہ ہے تاریخ میں
مکافات میں زجر و توبیخ میں

لیاقتؒ[3] علی جو ہوا تھا شہید
محبت تھی اس کو وطن سے شدید

کہوں طرز نو کی جو بنیاد کی
تو مرہون منت ہے آزادؒ[4] کی

نئی شاعری کی جو بنیاد ہے
حقیقت میں وہ رنگِ آزاد ہے

دیا نظم کو اس نے ایسا مقام
ملی شاعری کو بقائے دوام

1۔ سید امجد حسین امجد حیدر آبادی

2۔ پیارے لال شاکر میرٹھی

3۔ لیاقت علی خان شہید وزیر اعظم پاکستان۔

4۔ مولانا محمد حسین آزاد۔

مسدّس جو حالیؒ[1] کا شاہکار ہے
وہ ماضی کی عظمت کا پرچار ہے
وہ شبلیؒ[2] کہ شاعر ہے نقّاد ہے
قلم اس کا لغزش سے آزاد ہے
فقط میرٹھیؒ[3] ایسا فنکار ہے
کہ جو پھول کلیوں کی مہکار ہے
ہے اکبر کا طنز و مزاح ایسا کام
کہ اس فن میں مانا گیا ہے امام
مُبلّغ ہے اقبالؒ[4] اسلام کا
مفسر ہے آغاز و انجام کا
جو لندن کا کرتے ہیں شاعر طواف
ادب کا چڑھاتے ہیں اس پر غلاف
کرشمہ ہے یہ فیضؒ[5] مرحوم کا
لباسِ غزل اس نے فن کو دیا

1۔ مولانا الطاف حسین حالی

2۔ مولانا شبلی نعمانی

3۔ محمد اسماعیل میرٹھی

4۔ حکیم الامت علامہ اقبال

5۔ فیض احمد فیض

نہ تھا جوشؔ[1] کا فن میں کوئی جواب
کہاں سو گیا شاعرِ انقلاب

طرفدار دانشؔ[2] تھا مزدور کا
رہا تھا وہ ہمدرد مجبور کا

نہیں درمیاں آج سبطِ حسنؔ[3]
ادب کا لگا ہے برہنہ بدن

ہے ناصرؔ[4] نے لکھی وہ خوں سے غزل
کہ اشکوں کے اس نے کھلائے کنول

جسے لوگ کہتے ہیں شاعر منیرؔ[5]
مجھے وہ لگا ہے ادب میں کبیر

جسے لوگ کہتے ہیں عبدالمتینؔ[6]
لگا شاعری میں مجھے وہ ذہین

شررؔ[7] بھی ادب میں چمکتا رہا
ادب کے افق پر دمکتا رہا

1۔ جوش ملیح آبادی

2۔ احسان دانش

3۔ سبط حسن

4۔ ناصر کاظمی

5۔ منیر نیازی

6۔ عارف عبدالمتین ۔ 7 مولانا عبدالحلیم شرر

جو اختر[1] نے اپنایا رومان کو
ادب میں وہ لایا نئی شان کو

کہاں ہے وہ گیتوں کا مالک حفیظ[2]
رہا تھا جو ریتوں کا مالک حفیظ

وطن پاک کا جو ترانہ لکھا
تو اک روح پرور فسانہ لکھا

تھا ماضی کی دنیا میں جو تاجور[3]
فرنگی ادب سے رہا بہرہ ور

جو جدت روایت تھی تاثیر[4] میں
وہ تھی جلوہ گر ان کی تحریر میں

تھے سالک[5] بھی جدت کے زیرِ اثر
روایت کے شیدا تھے اپنی مگر

موہانی[6] جو ملت پہ غمناک تھے
تو اپنے بیاں میں وہ بیباک تھے

جو خالد[7] نے ڈالی ہے نظموں میں جان
تو شعر و سخن کی بڑھی آن بان

1۔ محمد داؤد اختر شیرانی ۔2 حفیظ جالندھری ۔3 احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی ۔4 ڈاکٹر تاثیر۔ 5 مولانا عبدالمجید سالک ۔6 سید فضل الحسن حسرت موہانی

7۔ ڈاکٹر تصدق حسین خالد مرحوم آزاد نظم کا پیش رس

ملا "الا مکاں" کا جو شاعر مجھے
وہ فن میں لگا ایک ماہر مجھے

وہ ہے نظمِ آزاد کا پیش رو
ہے اس کی تغزل میں رنگین رو

جو آفاق[1] فن کا مبصر ہوا
تو غالب کا اپنے مفسر ہوا

جو خاور[2] نے اپنا اٹھایا قلم
تو ششدر ہوئے اس سے روم و عجم

جو "جاوید نامہ" کو دی ہے زباں
مثال اس کی ہے فارسی میں کہاں

نہیں "ماہی خانہ" کا اس کے جواب
وہ لگتا پرستاں کا ہے شوخ خواب

جو "ابرِ گہربار" دیکھو گے تم
گلوں کو شرر بار دیکھو گے تم

کیا معرکہ فارسی کا جو سر
ہوا فن کی دنیا میں وہ معتبر

غزل فارسی کی ہے جادو اثر
کہ ہے وہ مثالی طلسمِ ہنر

1۔ آفاق حسین آفاق کراچی 2۔ رفیق خاور "ماہِ نو" کا سابق مدیر

ظفر[1] نے لیا کام ہتھیار کا
ادب سے تھا رشتہ مگر پیار کا

رہے میر[2] اپنے ادب کے اسیر
وہ اقلیمِ غم میں بہت تھے امیر

رہا درد[3] کا صوفیانہ کلام
پلاتے رہے وہ مُحبّت کا جام

جو اردو زباں کا بھی ماہر رہا
وہی داغ[4] اردو کا شاعر رہا

رہا ذوق[5] کو شاعری میں کمال
زباں کو نہ آئے گا اس کی زوال

جو یوسف حسن[6] کو بُھلا ہی دیا
تو ہم نے ادب کا بھی ماتم کیا

ہے محسن ادب کا جو پرشاد[7] تھا
وہ اردو نگر ہی میں آباد تھا

جو فانی[8] ہے غربت میں زندہ رہا
تو اردو غزل کو بہت کچھ دیا

نہیں ہے زباں پر جو زیدی[9] کا نام
نہ آئے گا اس کا کتابوں میں کام

1۔ مولانا ظفر علی خاں 2۔ میر تقی میر 3۔ خواجہ میر درد 4۔ نواب مرزا خاں داغ دہلوی 5۔ محمد ابراہیم ذوق 6۔ حکیم یوسف حسن 7۔ مہاراجہ سر کشن پرشاد 8۔ شوکت علی خاں فانی بدایونی 9۔ سید مصطفیٰ زیدی

وہ شاعر ہے میری نظر میں عظیم
محبت کی وادی میں بابا نسیم

رہا تھا ادب میں بڑا جس کا شور
محقق تھا اپنے زمانے کا زور[1]

ملک[2] بھی روایت میں آزاد تھے
دبستان مشرق میں آباد تھے

بہت مہر[3] نے دادِ تحقیق دی
جو علم و ادب سے نہیں اس سے فی

جو افسر[4] نے نظمیں لکھیں ہیں بہت
نصیحت کی باتیں کہی ہیں بہت

کیا میرا جی[5] نے جو رستہ قبول
وہ کرتے رہے اس سے شہرت وصول

لگا وہ ادب میں سراپا بہار
جسے لوگ کہتے ہیں اختر نثار[6]

جو اس کی رہی تھی رفیقِ حیات
سُنی تھی نہ اس نے کبھی اس کی بات

کرشن چندر[7] تھا جو ہمارا ادیب
نگاہوں میں رہتے تھے اس کے غریب

1۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور 2۔ مجید ملک 3۔ [illegible] 4۔ [illegible] 5۔ [illegible]
6۔ جاں نثار حسین اختر 7۔ کرشن چندر

ادب میں کیا تھا اسدؔ[1] نے جو کام
تو پایا ہے اس نے یگانوں میں نام

جو تھے شہرِ فن میں کبھی قادریؔ[2]
ادب میں لگے تھے مجھے صابری

نہیں ملک میں کوئی عبدالحکیمؒ[3]
جو منطق میں ٹھہرے ہمارا حکیم

نئی سوچ بخشی تھی عثمانؔ[4] نے
اچھوتی لگی نثر میں اس کی لے

جو نیرؔ[5] رہا شاعری میں سفیر
مدینے کی گلیوں کا تھا وہ فقیر

کہاں سوگیا آج کرنل رشیدؔ[6]
کسی سے بھی رکھی نہ دید و شنید

جو اسلمؔ[7] نے لکھے ہیں ناول بہت
وہ لگتے تھے لکھنے میں قابل بہت

کبھی میکدے میں تھا اپنے عدمؔ[8]
کبھی شاعری میں تھا اس کا قدم

جلیلیؔ[9] نے لکھا ہے جو مرثیہ
ادب میں ملے گا اسے مرتبہ

1۔ اسد ملتانی 2۔ منظور حسین ماہر القادری 3۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم 4۔ پروفیسر عثمان 5۔ حکیم سید نیر واسطی 6۔ کرنل خواجہ عبدالرشید 7۔ ایم اسلم 8۔ عبدالحمید عدم 9۔ اثر جلیلی

ڈرامے جو لکھے ہیں عباس[1] نے
مُعطّر کیا ان کی بوباس نے

نیازی[2] نے جو بھی کیا ترجمہ
پسند اس کو اقبال نے بھی کیا

جو حافظ[3] تھے نعتوں کے شیدا بہت
کیا نام نعتوں میں پیدا بہت

رہا "ادبی دنیا" ادب کا نقیب
ہوئی اس کو ہر دلعزیزی نصیب

رہا تھا جو دنیا میں اس کا مدیر
ادب میں نہیں ملتی اس کی نظیر

ادب میں مجاہد محمد طفیل[5]
وہ علم و ہنر میں تھا مانند سیل

صحافت کا پُر نور تارا "نقوش"
ہے ایسا نقشِ دلارا "نقوش"

ہے "اوراق" کا جلوہ آرا وزیر[6]
ہے شعر و ادب کا ضمیرِ منیر

کراچی کی اُمیدؔ[7]، اُمید ہے
غزل میں جو مشتاقِ تجدید ہے

1۔ غلام عباس ۔ 2 سید نذیر نیازی ۔ 3 حافظ مظہرالدین صدیقی ۔ 4 مولانا صلاح الدین ۔ 5 محمد طفیل ۔ 6 ڈاکٹر وزیر آغا ۔ 7 امید فاضلی (کراچی)

جو سردار نقوی[1] ہے روشن جبیں
وہ مدت سے لگتا ہے گوشہ نشیں

ہے محسن بھوپالی[2] ادب کی بہار
غزل کے لئے مایۂ اعتبار

جو روحِ ادب محسن احسان[3] ہے
بہ نظم و غزل اس کی کیا شان ہے

ادب میں بغاوت کا راشد[4] نشاں
ہے آباد اس سے ہی فن کا جہاں

غزل سے حفیظ[5] اپنی تائب ہوا
تو نعتوں میں جامی کا نائب ہوا

وہ طاہر[6] ادب کا جو نقاد ہے
قلم اس کا شیریں، وہ فرہاد ہے

وہ ہے منفردِ فکرِ تحقیق میں
نظر آتا ہے اپنی تخلیق میں

جو پڑھتا ہے مسجد میں فن کی نماز
اسے لوگ کہتے ہیں احمد فراز[8]

جو آفاق[7] فن کا مُبصّر ہوا
تو غالب کا اپنے مُفسّر ہوا

---

1. سردار نقوی (کراچی)۔ 2. محسن بھوپالی (کراچی)۔ 3. محسن احسان پشاور۔ 4. ن۔ م۔ راشد۔ 5. پروفیسر حفیظ تائب
6. طاہر تونسوی۔ 7. آفاق حسین آفاق۔ 8. احمد فراز

ہے گیتوں کا فن کار ایسا قتیلؒ
ہیں نغمات اس کے حسین و جمیل

حمایت علیؒ جب سے شاعر ہوا
ہے دل جیتنے کا بھی ماہر ہوا

اسے کھا گئی کس کی نظریں یہاں
کہ مدت سے جانے ہے اظہرؒ کہاں

جو صہباؒ کا لہجہ ہے اونچا بہت
ہے اس کا تغزل بھی عمدہ صفت

مُحقّق تھا جو اپنا عبدالحمیدؒ
عقیدت رہی میری ان سے شدید

متانت ہے حکمت میں منظورؒ کی
لطافت ہے حکمت میں منظور کی

جسے لوگ کہتے ہیں ابن حنیفؒ
وہ کرتا نہیں ہے کسی کو خفیف

وہ یکتا ہے ماضی کی تحقیق میں
سند ہے حقائق کی تصدیق میں

عطا شادؒ شاعر ہے کہسار کا
وہ محبوب شاعر ہے سنسار کا

1۔ قتیل شفائی ۔ 2 حمایت علی شاعر (حیدر آباد) ۔ 3 جاوید اظہر ۔ 4 صہبا [illegible] ۔ 5 عبد الحمید [illegible]
چانسلر ہمدرد یونیورسٹی کراچی ۔ 7 ابن حنیف ۔ 8 عطا شاد کوئٹہ

قلم ہاتھ میں جونہی اس نے لیا
تو کوثر[1] نے مردوں کو زندہ کیا

جو ہے قاسمی[2] عالم با وقار
وہ ہے صوفیا کے دلوں کی بہار

جو ہے اپنے کلام میں شاعر نفیس
لگے شاعری میں مجھے وہ رئیس[3]

کراتا ہے لوگوں کو جو انتظار[4]
اسے لوگ کہتے ہیں فن کی بہار

کہانی میں اس کی خوشا وہ نکھار
نہیں ہے قلم پر کوئی اس کے بار

جو نرگس[5] بنی ہے غزل کا وقار
شرافت' متانت کا ہے وہ سنگھار

ہے شاہد[6] کا "سب رس" اب اردو کی جان
دلارا ہیں اس کے زبان و بیان

ہیں عالی[7] نے اپنے ترانے لکھے
تو جذبات اپنے ٹھکانے لگے

بسا ہے قلم کی رگ و پے میں یاد[8]
ادب کی زمیں پر وہ رہتا ہے شاد

1۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر کوئٹہ ۔ 2 مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی (سندھ) ۔ 3 رئیس امروہی ۔ 4 انتظار حسین ۔ 5 نوشابہ نرگس ۔ 6 خواجہ حمید الدین شاہد ۔ 7 جمیل الدین عالی ۔ 8 مشہور حسین یاد

ہے انشائیے میں جو اس کا مقام
وہ زندہ رہے گا ادب میں مدام

جو اجمل نیازی[1] ہے یکتا ادیب
نہیں کوئی دنیا میں اس کا رقیب

جو نوکِ قلم سے لکھے اس نے گیت
تو رقصاں ہے ان میں محبت کی ریت

عجب ہے عرب کی فضا کا سماں
کہ دخترِ ادب کی مُقیّد ہے واں

زباں کھولنے کی اجازت کہاں
ہے پَر تولنے کی اجازت کہاں

سعودی عرب میں ہے واقع ریاض
وہاں کون کھولے بدن کی بیاض

کیا عرش[2] نے میرا اونچا مقام
لیا اس نے مجھ سے مُحقّق کا کام

ہیں افسانے جتنے بھی اس نے لکھے
وہ ظلمت میں ہیں روشنی کے دیئے

وہ لگتا ہے ممتاز ہر بزم میں
وہ ہے منفرد نظم میں عزم میں

1۔ پروفیسر ڈاکٹر اجمل نیازی

2۔ پروفیسر ڈاکٹر عرش صدیقی سابقہ رجسٹرار بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان

نہیں علم سے اس کی خالی نیام
ہے اقلیمِ معنی میں اس کا قیام
ادب میں وہ رکھتا ہے اعلیٰ مقام
وہ ہے صبح ایسی، نہیں جس کی شام
جو ہاتھوں میں میرے ہے زخمی قلم
تو قرطاسِ دل پر کروں کیا رقم
کئے پیش میں نے عقیدت کے پھول
کریں مہرباں ان کو ہنس کر قبول
ہے اقلیم فن میں بہت کامران[1]
تو علم و ادب کا ہے وہ ترجمان
یہ دیوی غزل کی جو پروین[2] ہے
چمن میں وہ پھولوں کا اک سین ہے
ادھر وہ قلم کار اصغر ندیم[3]
ہے تمثیل کے فن میں یکتا حکیم
ہے ممتاز نقاد دکتر سہیل[4]
ہے جس نے چڑھائی مُحبّت کی بیل
ہے تنقید و فن میں جو ماہر سلیم[5]
تب شعر و ادب میں ہمارا کلیم

1۔ [illegible] کامران ۔ 2۔ پروین شاکر ۔ 3۔ اصغر ندیم سید ۔ 4۔ ڈاکٹر سہیل احمد ۔ 5۔ ڈاکٹر سلیم اختر

ہیں موضوعِ بحث اب قدیم و جدید
ہے ممتاز نقاد انور سدید[1]

جو ہمدم[2] ہے اب کوئٹہ میں مقیم
وہ علم و ہنر میں ہے اپنے عظیم

ہے رضوی[3] کو حاصل بڑا اختیار
وہ نوکِ قلم سے اترتے ہیں پار

جو ہے قاسمی[4] اپنا کالم نگار
غزل، نظم دونوں میں اس کی بہار

پڑھا جب سے میں نے صحیفہ "فنون"
ہوا شاعری کا مجھے بھی جنون

ہے امجد[5] ڈرامے میں بااختیار
ہے ہاتھوں میں اس کے غزل کی ستار

جسے لوگ کہتے ہیں بخت معین[6]
وہ زیرِ فلک اک انوکھی زمین

دیا شاعری کو نیا اک لباس
کہ جس کے تکلم کی بچ تھی اساس

کہاں سو گیا ہے وہ اپنا وقار[7]
تھی الفاظ میں جس کی شانِ بہار

1۔ ڈاکٹر انور سدید ، 2۔ نور محمد ہمدم [illegible] ، 3۔ حسن رضوی ، 4۔ احمد ندیم قاسمی ، 5۔ [illegible] ، 6۔ [illegible] معین

مرحوم ، 7۔ وقار انبالوی مرحوم

لکھی جس نے روح و بدن کی بیاض
وہ ہے شاعری کی نوا گر ریاض[1]
دکھایا ہے اس نے "دریدہ بدن"
سجایا ہے اس نے لہو سے چمن

ہے اسلم[2] نے دھارا ہوا ایسا روپ
جلاتی نہیں جسم کو اس کی دھوپ
ہے اس کی غزل میں جو لہجہ عجیب
کسی کو نہیں ویسا لہجہ نصیب

ہے اصغر علی شاہ[3] قصیدے کی جان
ہے اس صنف میں اس کی کیا عزّ و شان!
مُزیّن ہیں روشن خیالات سے
ولی ہیں سخن کی کرامات سے

کہاں تک رقم ہوں ادیبوں کے نام
رہے جارہے ہیں عزیزوں کے نام
جو نوکِ قلم پر نہیں آئے نام
بجا ہے یہ کوشش رہی تشنہ کام

جو سب کو سمجھتا ہے اپنا حبیب
وہ صفدر نہیں ہے کسی کا رقیب

1۔ فہمیدہ ریاض ۔ 2۔ پروفیسر اسلم انصاری ۔ 3۔ پروفیسر اصغر علی شاہ

جو فرمانؔ[1] ہے اب محقق عظیم
ادب کے چمن میں وہ باد نسیم
فراقیؔ[2] ہے جو آج کالم نگار
ہوا ہے وہ تنقید میں سب پہ بار

غزل کی زمیں پر جو آکاش ہے
وہ فکر و نظر کا بھی نقاشؔ[3] ہے
ادب پر جو رکھتا ہے گہری نظر
فلک پر ہے وہ شاعری کی سحرؔ[4]

ادب میں ہے جو عسکریؔ[5] کا مقام
وہ تنقید کا ہے جہاں میں امام
جو معیار بخشش ہے تنقید کو
نہیں ترک کرتا وہ تنقید کو

افق پر ملا فن کے مظہر جمیلؔ[6]
ملی تجزیے میں ہے اس کے دلیل

1۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری

2۔ تحسین فراقی۔ شاعر کالم نگار اور نقاد

3۔ نقاش کاظمی کراچی

4۔ سحر انصاری کراچی

5۔ محمد حسین عسکری مرحوم اردو ادب میں قطبی ستارہ

6۔ مظہر جمیل۔ طلوع افکار کراچی

جو اقلیمِ فن میں ہے احسن کلیم[1]
وہ تنقید کا ہے ادب میں سلیم[2]
جو فکر و سخن میں تھا ماہر سلیم
نظر میں تھے اس کے جدید و قدیم

ہوا شاعری کا جو اپنی وکیل
قلمرو میں اردو کی وہ ہے شکیل[3]
رہی فن میں امجد[4] کے جدّت بہت
تھی احساس میں اس کے شدّت بہت

جو سندھی ادب میں ہے بندہ نواز
وہ اقلیمِ فن میں ہے اپنا ایاز[5]
نظر ہے نظر اور ظہورِ[6] نظر
غزل کے چمن میں تھا وہ اک شرر

1۔ احسن کلیم

2۔ سلیم احمد مرحوم

3۔ شکیل بدایونی

4۔ مجید امجد مرحوم

5۔ شیخ ایاز سندھ کا ممتاز شاعر

6۔ ظہور نظر مرحوم بہاولپور

تھا صوفی تبسم[1] غزل کا مزاج
تھا اقلیم فن پر کبھی اس کا راج

غزل کی قلمرو میں جو ہے علیم[2]
نئی شاعری کا وہ ٹھہرا کلیم

ہے پروین شاکر[3] غزل کی بہار
کہ ہے رنگ و نکہت سے اس کا وقار

وہ ساغر[4] تھا بیچی تھی جس نے غزل
نہ تھا تیوری پر کوئی اس کے بل

ملا ہے جسے شاعری میں وقار
قلمرو میں فن کی ہے وہ افتخار[5]

نمایاں ادب میں جو ناہید[6] ہے
تو حاصل اسے سب کی تائید ہے

1۔ صوفی تبسم مرحوم

2۔ عبید اللہ علیم

3۔ پروین شاکر پاکستان کی ممتاز شاعرہ

4۔ ساغر صدیقی مرحوم

5۔ افتخار عارف

6۔ کشور ناہید

قلمرو میں فن کی ملا جو انیسؔ[1]
ادب میں لگا ہے مجھے وہ رئیس
جو برلاسؔ[2] شاعر ہے زیرِ فلک
دکھائی ہے اس نے بھی اپنی جھلک

نہ بے جا کسی پہ ہے تنقید کی
کسی کی نہ میں نے ہے تقلید کی
نہ بے جا کسی پر اُٹھایا قلم
قلم کے تقدّس کا رکھا بھرم

جگرؔ[3] کی غزل میں قدیم و جدید
غزل میں رہا اس کا جذبہ شدید
نمایاں لگا ہے غزل میں فراقؔ[4]
بیاں میں ہے اس کے سیاق و سباق

بہت نامور نظم میں ہے فرازؔ[5]
فضا میں اُڑاتا ہے شعروں کے باز
جو فن کی بلندی پہ ٹھہرا فرازؔ[6]
غزل کی زمیں پر ہے وہ سرفراز

1۔ انیس ناگی

2۔ مرتضیٰ برلاس

3۔ علی سکندر جگر مرادآبادی ۔ 4۔ رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری ۔ 5۔ رحمان فراز ۔ 6۔ احمد فراز

فلاحِ جہاں جس کا مقصود ہے
صحافت میں وہ شخص مسعودؔ[1] ہے
ہے آزادیِ فکر پہ جس کو ناز
یہ ہے اس کا سرمایۂ امتیاز

ملا جس کو اقلیم فن میں دوام
ہے مسعود اشعرؔ[2] وہ عالی مقام
یہ فخرِ زماںؔ[3] ہے یہ فخرِ زماں
ہے تحریر میں جس کی طوفاں رواں

وہ ہے ایک ایسا گرامی ادیب
جو رکھتا ہے لوگوں کو اپنا حبیبؔ[4]
سیاست پہ رکھتا ہے گہری نظر
فلک پر ادب کے چمکتا قمر

نمایاں ادب میں جو جالب رہا
وہ گردش پہ دوراں کی غالب رہا
جو ہر زخم سینے پہ سہتا رہا
یہ جینے کی ہی بات کہتا رہا

جو مودودیؔ[5] تھے اک محقّق عظیم
نظر میں تھے ان کے جدید و قدیم

1۔ مسعود اشعر۔ 2۔ مسعود اشعر۔ 3۔ فخر زماں۔ 4۔ حبیب جالب

5۔ ابو الاعلیٰ مودودیؒ

رہے تھے وہ مصروف تحقیق میں
نہ گزرا کوئی لمحہ تطبیق میں

جو جالی مصور[1] ہے اسلام کا
مخالف ہے روحوں کی نیلام کا

ہے خضرا کا گنبد اسے یوں عزیز
مسلماں کی ہوتی ہے اس سے تمیز

ہے مقتدرہ اردو زباں کا سنگھار
بنے گا گلے میں وہ صوبوں کا ہار

قریشی[2] ادب کا جو معمار ہے
وہ نقد و نظر کا پرستار ہے

کئی کالجوں میں مُعلّم رہے
کبھی شعر بھی کیف پرور کہے

زبانوں پہ ان کو ہے قُدرت بہت
ہے تحریر میں ان کی نُدرت بہت

کتابیں رہی ہیں ہمیشہ رفیق
بہت رکھ رکھاؤ میں ہیں وہ خلیق

ادب کا جو خوش رنگ گلزار ہے
پریشاں خٹک[4] اس کی مہکار ہے

1۔ جالی مصور اسلام ۔ 2 ڈاکٹر عبدالوحید قریشی

3۔ ڈاکٹر سہیل احمد ۔ 4 پریشان خٹک پشاور سرحد

پریشاں خنک ہے ادیبوں کا مان
بڑھائی ہے اس نے زمانے کی شان

جو اربابِ فن کو وظیفہ دیا
تو دامن دعاؤں سے اس کا بھرا!

کیا جالبیؔ[1] نے ہمیں روشناس
ثقافت ہے جینے کی اپنے اساس

ہماری ثقافت کے [illegible] منیرؔ[2]
قلم میں ہیں صوفی و سالک منیر

بنایا ہے جس نے محبت کو دین
وہ اقلیم فن میں ہے عارف معینؔ[3]

غزل کی زباں میں ہے جو سرخ رو
وہ راغبؔ[4] رباعی کی ہے آبرو

رباعی میں راغب کی ہے وہ جمال
کہ فکر و نظر کا ہے جس میں وصال

ہر اک نعت جس کی ہے آنکھوں کا نور
وہ صوفی کی محفل میں دل کا سرور

جو بیدار ہوتا ہے اس سے شعور
تخیّل میں بستے ہیں آکر حضورؐ

1۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کراچی ۔ 2 سراج منیر (مرحوم) ۔ 3 عارف معین بلے

4۔ اصغر حسین راغب مراد آبادی

ہر اک صنف پر ہے جسے اختیار
گلستانِ فن میں ہے اس کے بہار

جو اشرف[1] ڈرامے کا بہزاد ہے
وہ اپنی قلمرو میں شہزاد ہے

ہمارے ادب میں جو انوار[2] ہے
وہ تنقید اور فن میں تلوار ہے

جو باب مروت میں صابر رہا
وہ اپنے ادب میں جابر[3] رہا

جو ملتان میں تھا تمہارا رفیق
کہاں پر ہے وہ اب مُفکّر عتیق[4]

جو عابد کو دیکھا بہ نظر عمیق[5]
تو پایا اسے فکرِ نو میں غریق

ہے ہاکو کا ٹھہرا جو موجد امین[6]
تصرّف میں ہے اس کے فن کی زمین

لکھے ہیں جو حیدر[7] نے انشائیے
ہیں مکّار چہروں کو وہ آئینے

ہے شفقت[8] کی غزلوں میں حسرت کا رنگ
جو شیشے میں کرتا ہے تعمیر سنگ

1۔ پروفیسر ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف۔ 2۔ پروفیسر ڈاکٹر انوار احمد۔ 3۔ پروفیسر سید جابر علی جابر مرحوم۔ 4۔ علامہ عتیق فکری مرحوم۔ 5۔ پروفیسر عابد عمیق۔ 6۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد امین۔ 7۔ پروفیسر صلاح الدین حیدر۔ 8۔ شفقت کاظمی

جو اقلیمِ فن میں ہے اپنا خیال
غزل میں وہ رکھتا ہے اپنا کمال

جو ہے شاعری کا مُفکّر ندیمؔ[1]
ہیں اس کی نظر میں جدید و قدیم

جو محسنؔ[2] ہے دنیا میں شیدائے فن
غزل اس کی رقصاں چمن در چمن

ہے ساجدؔ[3] کی غزلوں میں غالب کا رنگ
جو شیشے میں کرتا ہے تعمیرِ سنگ

دیا "گونگی چیخوں" کا جس نے جواب
وہ شاہدؔ[4] ہے غزلوں کا رنگیں شباب

نئی شاعری میں مسلّم ہے وہ
چمن میں بہاروں کا موسم ہے وہ

1۔ ندیم جعفری

2۔ محسن نقوی

3۔ پروفیسر غلام حسین ساجد

4۔ پروفیسر عبدالرزاق شاہد

مستقبل، جمہوریت کے آئینہ میں

ہے بھٹو[1] کو دنیا میں یہ فخر آج
کہ بخشا ہے جمہور کو شوقِ راج
اسلامک سمٹ کا جو بانی ہے وہ
اتاترک کا اپنے ثانی ہے وہ
بنی ہے جو بھٹو کی اب جانشیں
وہ ہے خاتم آگہی کا نگیں
جو بھٹو نے چھوڑا ادھورا مشن
کرے گی دلیرانہ پورا مشن
جو لوگوں کے دل میں بسی بینظیر[2]
ہوئے سب اسی کے صفیر و کبیر
جو درسِ مساوات اس نے دیا
تو محلوں میں اک حشر برپا ہوا
کہ جشنِ مسرت منائیں گے کب
سلاطینِ جمہور آئیں گے کب
بدل کر رہے گا یہ کہنہ سماج
جو ہوگا تو جمہوریت ہی کا راج

1۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم سابقہ وزیراعظم پاکستان

2۔ بینظیر بھٹو سابقہ وزیراعظم پاکستان

چلے گا نہ سکہ کسی نام پر
اندھیرا نہ ہوگا کسی بام پر
کسی گھر میں ہوگی نہ غربت کہیں
نہ ہوگی کسی دل میں حسرت کہیں

صلیبوں کا کتبہ نہ ہوگا کہیں
کہ باطل کا نقشہ نہ ہوگا کہیں
نہ ہوگا کہیں سیم و زر کا نظام
نہ انسان انساں کا ہوگا غلام

جو نقشِ غلامی نہ ہوگا کہیں
جھکے گی نہ آقا کے در پر جبیں
یتیموں کے چہروں پہ ہوگا نہ غم
تو آنکھوں میں ہوں گے نہ اشکِ الم

جو بیوہ کو سر پر بٹھائیں گے لوگ
تو ظلمت میں دیپک جلائیں گے لوگ
نگہبان ہوگی شرافت یہاں
جہاں تاب ہوگی محبت یہاں

فنونِ لطیفہ بنیں گے سنگھار
تو رقصاں گلستاں میں ہوگی بہار
نہ پھیلے گا دنیا میں خوف و ہراس
نہ خوں سے بجھائے کوئی بھی پیاس

اذانِ سحر سے جگائیں گے لوگ
مساجد میں سر کو جھکائیں گے لوگ
جو آئینِ ظلمت کو توڑیں گے لوگ
تو ظالم کی آنکھوں کو پھوڑیں گے لوگ

جہاں اک نیا پھر بسائیں گے وہ
تو جشنِ چراغاں منائیں گے وہ
نہ قیصر و کسریٰ جو ہوں گے یہاں
چلے گا مساوات کا کارواں

نہ ہوں گے زمانے میں جاگیردار
نہ ہوں گے وہ لوگوں کے شانوں پہ بار
جو چلتے ہیں اب سر اٹھا کر کسان
ہیں قوّت کے عظمت کے ٹھہرے نشان

جو جینے کے میں نے سکھائے ہیں گُر
تو تارِ شکستہ سے نکلے ہیں سُر
جو بجھ بجھ کے میں نے جلائے چراغ
تو روشن ہوئے ان سے قلب و دماغ

ہے اندھوں کے ہاتھوں میں تیر و کماں
تو گونگوں کو میں نے عطا کی زباں
پلایا ہے لوگوں کو جامِ حیات
مُیسّر ہو دنیا میں ان کو ثبات

نظر میں نہیں میری کون و مکاں
جنوں ہے خزاؤں میں میرا جواں

یہ ہونٹوں پہ رہتی ہے میرے دعا
رہے فضل لوگوں پہ تیرا ' خدا

ہے جب سے مرے لب پہ رقصاں غزل
کھلے آنکھ میں چاندنی کے کنول

جو سازِ مساوات بجنے کو ہے
تو نغمہ لبوں پر مچلنے کو ہے

نہیں ہے مجھے کوئی دعوائے فن
سجایا ہے پھولوں سے فن کا چمن

ستاروں سے اپنا سجایا وطن
کریں گے جہاں رقص بیرا بدن

رہی شاعری سے ہمیشہ لگن
رہا ہوں ہمیشہ ہی اس میں مگن

سنبھالا ہے جس دن سے میں نے قلم
ہوں رکھنے لگا میں زمیں پر قدم

سب آثارِ ظلمت مٹاؤں گا میں
نئی ایک دنیا بساؤں گا میں

عدالت کا سکّہ چلا ملک میں
تو رُتبہ ہر اک کا بڑھا ملک میں

ہوا بول بالا جو انصاف کا
تو منزل کی جانب بڑھا قافلہ
عدالت نے جو بھی کیا فیصلہ
ملا اس سے لوگوں کو پھر حوصلہ

دسمبر اٹھاسی ہے تاریخ ساز
کھلا حُریّت کا زمانے پہ راز
کرایا ہے جو صدرؒ[1] نے انتخاب
نہیں اس کا دنیا میں کوئی جواب

کیا فوج نے قوم کو سرفراز
ملی بیگ کو اس سے عُمرِ دراز
ہے تاریخ میں آج اسلمؒ[2] کا نام
وہ زندہ رہے گا دلوں میں مدام

جو قائدؒ[3] کی دختر نے تدبیر کی
تو ملّت کی پھر اس نے تعمیر کی
دیا قوم کو اس نے جب سے شعور
ہر اک ہاتھ میں ہے صحیفۂ نور

جو فکر و تخیّل ہیں اس کے اسیر
تو لوگوں کی آنکھوں میں ہے بینظیرؒ[4]

۔ 1 جناب غلام اسحاق خاں ۔ 2 اسلم بیگ سابقہ چیف آف آرمی اسٹاف ۔ 3 شہید ذوالفقار علی بھٹو وزیر اعظم پاکستان

۔ 4 بینظیر بھٹو صاحبہ سابقہ وزیر اعظم پاکستان

کیا اس نے لوگوں کو بیدار جب
تو کرتے ہیں لوگ اس کا دیدار اب

جو لوگوں کو بخشا شعورِ وجود
ہوئیں سب کو معلوم اپنی حدود

وہ علم و ہنر میں ہے بالغ نظر
سیاست نے اس کو کیا نامور

جو ملت کی اپنے وہ آواز ہے
تو ملت کی اپنے انا ساز ہے

ضمیر اس کا باطن میں ہے خودنگر
نہیں وہ کسی چیز سے بے خبر

نظر اس کی روشن ہے خود ذات سے
عیاں ہے دلیل اس کی ہر بات سے

وہ رہتی ہے اقوام سے باخبر
سیاست و حکمت ہیں زیرِ نظر

وہ لگتی ہے لوگوں کو روشن ضمیر
وہ قول و عمل میں ہے اپنے امیر

کیا کارواں کو جو گرمِ سفر
ملی اپنی منزل کی سب کو خبر

جو حکمت کی دنیا میں ہے وہ مقیم
تو علم و ہنر میں ہے ٹھہری عظیم

ملا ووٹ سے جب اسے اقتدار
بڑھا ملک کا اس سے اپنے وقار
جونہی وہ حکومت پہ فائز ہوئی
جو تھی بات جائز وہ جائز ہوئی

سزا موت کی اس نے منسوخ کی
دعا صبح و شام اس کو سب سے ملی
بڑھاپے کا رکھا ہے اس نے خیال
دیا جیل سے اس نے سب کو نکال

پرندے فضا میں چہکنے لگے
گلستاں گلوں سے مہکنے لگے
جو آئی چمن میں نرالی بہار
تو شاخوں نے پہنے ہیں پھولوں کے ہار

ہوئے جب سے آزاد قیدی یہاں
دعائیں لبوں پر ہوئی ہیں رواں
یتیموں کی آنکھوں میں ہے اب چمک
کہ رقصاں ہے چہروں پہ ان کے دمک

کیا فیصلہ اپنا جب ووٹ سے
کھرے کو نکالا ہے اب کھوٹ سے
ہے دستِ تصرّف میں اپنا وطن
سجایا ہے اپنے لہو سے چمن

جو لوگوں میں اب جوشِ کردار ہے
تو اس سے پشیمان غدار ہے

ہی میرا وطن آج رشکِ بہار
کہ ہیں چاند سورج بھی اس کا سنگھار

بہاریں گلستاں میں محوِ عمل
خزاؤں میں کھلنے لگے ہیں کنول

دیا ہے سبق اس نے نادار کو
شفا کیسے ملتی ہے بیمار کو

کُھلا ہے غریبوں پہ رازِ حیات
کہ ملتا ہے دنیا میں کیسے ثبات

دیا اس نے لوگوں کو سوزِ جگر
تمنا ہے جینے کی بارِ دگر

طے ملک میں جب اسے حق شناس
مُیسّر ہوئی اس کو محکم اساس

وہ وعدوں کو اپنے نبھائے گی خوب
نظامِ حکومت چلائے گی خوب

غلط فہمیوں کو مٹائے گی وہ
ہر اک کو ہر اک سے ملائے گی وہ

جو پیدا نہ ہوگا کہیں انتشار
گراں طبعِ دشمن پہ ہوگا یہ بار

یہ جاری رہیں گے نشیب و فراز
یہ کرتے رہیں گے ہمیں سرفراز
وہ رکھّے گی قائم ہمیشہ وفاق
نہ پھیلے گا صوبوں میں کوئی نفاق

قیادت میں اس کی بڑھیں گے عوام
چلے گا مُحبّت ، اُخوّت سے کام
یہ حاصل ہوا ہے ہمیں اب وثوق
ملیں گے یہاں مرد و زن کو حقوق

کریں گے فرائض ادا مل کے سب
مُقدّر غریبوں کے بدلیں گے اب
نہ سوئے گا بھوکا کوئی اب کسان
نہ بیکار بیٹھے گا کوئی جوان

جو مِلّت کی اپنے بڑھائیں گے شان
تو شائستہ اُن کی رہے گی زبان
جہالت کا ہوگا نہ کوئی نشاں
نہ رشوت چلے گی ہمارے یہاں

ملی جب سے لوگوں کو جمہوّریت
نہیں باقی لوگوں میں مجبوّریت
جو دستِ تعاون بڑھائیں گے لوگ
تو پروان سب کو چڑھائیں گے لوگ

مساوات کو دیں گے نغمہ نغمہ فروغ
نہ کام آئے گا اب کسی کے دروغ

کرے گی حفاظت امانت کی وہ
طرفدار ہوگی صداقت کی وہ

زِ دل قدر داں ہے شجاعت کی وہ
پرستارِ دائم دیانت کی وہ

قیادت میں اس کی چلے گا نظام
کہ صوبوں میں ہوگا اب انصاف عام

نہ ہوگا لٹیروں کا کوئی نشاں
یہ خِطّہ بنے گا سکوں کا جہاں

نہ ڈاکہ پڑے گا کوئی ملک میں
نہ رہزن بنے گا کوئی ملک میں

نہ عصمت کا نیلام ہوگا یہاں
شرافت کا آباد ہوگا جہاں

ملے گی ہر اک کو جو تعلیم عام
نہ باقی رہے گا کوئی ذہن خام

کہ طلبہ ہمارے جو معمار ہیں
بزرگوں کی اپنے وہ دستار ہیں

نگاہوں میں مِلّت کے جو دین ہے
وہ مِلّت کے نزدیک آئین ہے

مبارک ہوں تم کو یہ آزادیاں
نہ ہوں گی غلامی کی پرچھائیاں
مبارک ہو سب کو یہ جمہوریت
ملی جاکے برسوں میں یہ حریت

جو رکھتی ہے ہاتھوں میں دستور اب
چلے گا مُحبت کا منشور اب
مُحبت سے سب کچھ سنور جائے گا
ہر اک آدمی اپنے گھر جائے گا

مُحبت کی صفدر ہوس ہے تمہیں
نفس کا نشیمن قفس ہے تمہیں

اقوامِ عالم تاریخ کے نئے موڑ پر

ہے زخمی لبوں پر یہ تازہ خبر
لہو میں ہے رقصاں طلوعِ سحر
فلک پر ہیں غمگین شمس و قمر
حرارت سے شبنم کی جھلسے شجر

کہاں کھو گیا ہے وہ رومی حکیم
ہوئے فلسفے جس کے سارے یتیم
ہے خاموش گلشن میں بادِ نسیم
دلِ بزمِ ہستی ہے جس سے دونیم

گرے ہیں جو فکر و نظر کے ستون
ہوئے ریزہ ریزہ علوم و فنون
جو دیکھا ہے دامن پہ حسرت کا خون
نہیں ذہن میں پھر بھی کوئی جنون

جو گردش میں ہیں پھر سے لوح و قلم
کروں گا میں رُوداد ان کی رقم
نہیں مجھ میں اب تابِ ضبطِ الم
امنڈ آئے آنکھوں میں سب درد و غم

بڑے حادثے ہیں یہ تاریخ کے
جو تاریخِ عالم کے عنوان بنے
لگا آج ہٹلر[1] مجھے بھی عظیم
جو پسپا نظر آئے اس کے غنیم

اجل سے وہ آنکھیں ملاتا رہا
لہو رنگ منظر دکھاتا رہا
کھلے ہیں یہاں آج عبرت کے باب
چکائے ہیں قوموں نے اپنے حساب

جو دیوارِ برلن کو ڈھایا گیا
ہر اک فاصلے کو مٹایا گیا
ہر اک کو ہر اک سے ملایا گیا
محبّت کا سکّہ چلایا گیا

بلا کے ہے دنیا میں جرمن عوام
کہ بدلا ہے لمحوں میں کہنہ نظام
وہ کرتے ہیں آئین کا احترام
حدیثِ وفا ہوگئی ہے تمام

یہ لایا ہے کس موڑ پر اب نفاق
کھنڈر بن گئی سرزمینِ عراق

---

[1] ہٹلر جرمنی کی سابقہ قدر آور شخصیت

رہے گا نہ جانے یہ کب تک مراق
نہ رکھے گا باہم کسی کو نفاق

بنائی ہے جو اپنے ہاتھوں سے قبر
ور اس میں نہیں کوئی، یہ بھی ہے جبر

کہوں کیا زباں سے میں صدّام[1] کو
وہ پہنچا ہے خود اپنے انجام کو

جو لڑتے تھے اپنے وطن کے لئے
وہ معذور ٹھہرے کفن کے لئے
دیا خون جس نے چمن کے لئے
تھی سولی ہی اُس خوش چلن کے لئے

جو مردانِ حُر تھے وہ مارے گئے
تو قلب و نظر کے سہارے گئے

مُسرّت کی آئی نہ کوئی نوید
مناتے تو کیسے دل افسردہ عید

نہ پلکوں پہ کوئی چراغاں ہوا
نہ آمد پہ جشنِ بہاراں ہوا
کھلیں گے یہاں کیسے دل کے کنول
کہ پھیکا ہے محفل میں رنگِ غزل

۱۔ صدام حسین۔ صدر سوشلسٹ ری پبلک عراق

جو زخموں کا موسم دہکتا نہیں
تو داغوں کا گلشن مہکتا نہیں
ملے ہیں جو زخموں کے تمغے یہاں
تو رُوداد اس کی رقم ہے کہاں
کمر ہو چلی جس کی میداں میں خم
زمیں چومتی ہے کب اس کے قدم
ہے زخمی لبوں پر جو ترکی کا نام
مخالف رہے جنگ میں مصر و شام
سعودی عرب تھا اگرچہ امام
وہ دشمن سے پھر بھی رہا ہم کلام
حرم کا نگہباں جو سرتاج تھا
سُپر طاقتوں کا وہ محتاج تھا
فلک پر فرشتے پریشان تھے
زمیں پر مسلماں پشیمان تھے
سُپر طاقتیں ہم پہ غالب ہوئیں
وہ مسلم ممالک کا قالب ہوئیں
نہ پیچھے رہا اس میں جاپان بھی
کہ شامل ہوا اس میں ہامان بھی
وہی امن بھی جس کا منشور ہے
مگر جنگ پہ وہ بھی مجبور ہے

ہر اک فیصلہ زر کا منظور ہے
ازل سے یہاں یہ ہی دستور ہے

فلسطین و اردن بھی خاموش تھے
اگرچہ وہ اندر سے پُر جوش تھے

نہیں آج مغرب کا کوئی حریف
مسلماں ممالک ہیں اس کے حلیف
تباہی میں ملّت کی ہیں یہ شریک
نہیں ہیں کسی موڑ پر یہ خفیف

جو کہلائے داتا یہاں پر امیر
وہ کرتے ہیں بھوکوں کو اپنا اسیر
ہوئے ہیں زمانے میں ہم بے ضمیر
ہے مغرب کی آنکھوں میں مشرق حقیر

کہ مغرب نے دھارا ہے کچھ ایسا روپ
اترتی نہیں صحنِ مشرق میں دھوپ

ہے آزادیوں کا زبانوں پہ راگ
ڈسے گا یہ مغرب کا کس کس کو ناگ
ہر اک سمت پھیلی ہے نفرت کی آگ
نہ جائیں گے غربت کے دنیا میں بھاگ

نگاہوں میں جگنو فلک پر نہ چاند
پڑی ہے ستاروں کی دنیا بھی ماند

جو صدیاں بنیں آج لمحوں کا ہار
وہ ذہنوں پہ ہے اک قیامت کا بار
ہوئے ملک تقسیم اس دہر میں
ہوئے ملک دونیم اس دہر میں

نہ یادیں ہیں گھر کی کسی ذہن میں
کہ جیسے ہر اک چیز ہو رہن میں
نہ رونق گلی میں نہ بازار میں
پھنسا ہے ہر اک شخص آزار میں

نہ ہونٹوں پہ مہریں کسی عزم کی
نہ تیاریاں ہیں کسی رزم کی
نہ پرچم ہے عہدِ وفا کا کوئی
نہ احساس باقی جفا کا کوئی

جو زخموں کا کوئی گلستاں نہیں
سرِ شام کوئی چراغاں نہیں
نہیں ایشیا کا کوئی بھی رفیق
کہے آج دنیا میں کس کو شفیق

یہ مغرب نہیں ہے کسی کا امیں
کہ مشرق کی ہے آج زخمی جبیں
نگہباں ہیں ناموس ملت کے کون
ہیں مالک یہاں آج دولت کے کون

محافظ بنے آج عزت کے کون
یہ بھوکے ہیں دنیا میں شہرت کے کون

زبانوں پہ ہے آج ذکرِ عرب
وہ ٹھہرے ہیں ذلت کا اپنی سبب
بظاہر ہیں محتاج ہم ان کے سب
بچائے گا ذلت سے ملت کو رب

نہ دھرتی کے ماتھے پہ افشاں چنُی
نہ آنکھوں میں خوابوں کی جنت بُنی
نہ ہم نے کسی دل کی دھڑکن سُنی
نہ ہم نے امیدوں کی چادر بُنی

اندھیروں میں جو لوگ پلتے رہے
وہ غربت کی دوزخ میں جلتے رہے
لہو عمر بھر جو اُگلتے رہے
تباہی کے قالب میں ڈھلتے رہے

سنائی ہیں جو لوریاں امن کی
تو اس سے عطا کی نئی زندگی

گھلا ہے جو سَم سارے آفاق میں
نہیں ہے اثر کوئی تریاق میں

جو گیت امن کے تھے سناتے رہے
وہ جنگوں میں ہم کو لڑاتے رہے

جو ظلمت کے دیپک جلاتے رہے
نشاں روشنی کے دکھاتے رہے
جو تہذیب کے گُل کھلاتے رہے
وہ تیرِ ستم بھی چلاتے رہے
ملے ہیں جو امرت کے چشمے یہاں
وہ نادار کو ہیں میسّر کہاں

جنہوں نے صداقت کی باتیں کہیں
مُقدّر انہی کا صلیبیں رہیں
زبانیں طلاقت سے محروم تھیں
بصیرت بھی آنکھوں میں باقی نہیں
جو لائے ہیں مفلس کو اب دار تک
نہیں ان کے ہاتھوں میں خوں کی مہک

ہوا روس تقسیم ٹکڑوں میں آج
ہے امریکیوں کا زمانے پہ راج
عرب کی زمیں دے رہی ہے خراج
بدلنے کو ہے یہ پُرانا سماج
کہاں ہے خورشید نور آفریں
ہے ظلمت کدہ مفلسوں کی زمیں

لہو میں نہیں کوئی سوزِ یقیں
نہ چمکی لہو سے کسی کی جبیں

ہوئی رات مفلس پہ سایہ فگن
زمیں پر ہوئی تیرگی خیمہ زن
جو مارے گئے جنگ میں بے وطن
میسّر نہ آیا نہیں بھی کفن

نہیں ہے لہو میں کوئی روشنی
ہے زخمی شگوں سے ابھی چاندنی
ہے سستی اجل سے یہاں زندگی
نہ راس آئی مفلس کو یہ بندگی

کہاں ہیں وہ لوح و قلم کے نقیب
نہ ماؤ[1]، لومبا[2] کسی کے رقیب
نہ فیض نظر ہے کسی کو نصیب
ہر اک ہاتھ میں ہے انا کی صلیب
ہے سوئیکارنو[3] بھی یہاں بدنصیب
نہیں ہے کوئی بھی کسی کا حبیب

نہ خوابوں کی تعبیر ہوگی یہاں
نہ وجداں کی تفسیر ہوگی یہاں
نہ جینے کی تدبیر ہوگی یہاں
نہ رنگین تصویر ہوگی یہاں

۱۔ ماؤزے تنگ چین ۔ 2 لومبا ۔ 3 سوئیکارنو سابقہ صدر انڈونیشیا

فلک سے زمیں پر گرا گربا چوف[1]
نہیں بُش[2] کو دنیا میں اب کوئی خوف

یہ کس موڑ پر تم نے توڑا ہے دم
کہ رقصاں ہے آنکھوں میں لوگوں کے غم

مسیحا کے ہاتھوں میں دیکھی جو لاش
چٹانیں ہوئیں قلب کی پاش پاش

ملا یلسن[3] کو جو اونچا مقام
وہ ٹھہرا ہے مغرب کا ادنیٰ غلام

ہوا روس میں ایسا برپا زوال
نہ لینن[4] کا باقی کوئی ہے جلال
یہ آیا ہے نوکِ زباں پر سوال
میسّر ہے کس کو جہاں میں کمال

کہ ہے نوکِ خنجر زبانوں پہ آج
اندھیرا ہے چھایا مکانوں پہ آج

برہنہ پڑی ہے تمدن کی لاش
بدن پر نہیں گرچہ کوئی خراش

نہیں چشمِ نم پر کوئی بھی نثار
کہ ہے پھر بھی پلکوں پہ اشکوں کا بار

1۔ میخائل گوربا چوف سوویت یونین کے سابقہ صدر۔ 2 بش صدر امریکہ۔ 3 بورس یلسن صدر روس۔ 4 لینن۔
کارل مارکس کے نظریے کو عملی شکل دینے والا

جنوں ماسکو کا ہے یا فصلِ دار
کہ رقصاں داوں میں ہے خونیں بہار
نہیں ہے کسی کا کوئی انتظار
سروں پر نہیں آج لوگوں کے بار

نہیں ماسکو کا کوئی ہم خیال
ہوا اس کا دنیا میں ایسا زوال
نظر میں نہیں اس کا کوئی جمال
کہ شیشے میں آیا ہے کچھ ایسا بال

نظر کی شکستوں کا کیا ہو شمار
چلا جا رہا ہے کوئی سوئے دار

نہیں جب کسی دل میں جینے کی آس
کروں کیا کسی سے میں اب التماس
جو پہنیں ہیں لوگوں نے خونیں لباس
نہیں ہے لہو کی کوئی ان میں باس

شکستوں کا چہروں پہ رقصاں دھواں
کہ ہیں سوئے مقتل یہاں سب رواں
سِلی نوکِ خنجر سے سب کی زباں
نہ ہوگا کسی سے یہ قِصّہ بیاں

نہیں ہے خفا ان سے اب برزنیف
جنھوں نے کیا ماسکو کو نحیف

جو ظالم یہاں آج معصوم ہے
کہ حاکم یہاں آج محکوم ہے
تکلّم سے ہر ہونٹ محروم ہے
تمنّا ہر اک دل میں مغموم ہے

ہے لوگوں کی آنکھوں میں خوف و ہراس
ہے ظلمت میں چھلنی کرن کا لباس

جو قبروں پہ آئیں ہیں تیرہ جبیں
وہ قبروں پہ رہتے ہیں سجدہ نشیں

جو صحرا میں لائی ہے دیوانگی
تو ہونٹوں کی بڑھنے لگی تشنگی

غموں کو کسی نے نہ بانٹا یہاں
نہ پتھروںؒ سے شیشوں کو چھانٹا یہاں

جو اپنی ہی انکھوں میں پتھرؒ ہوا
تو خاروں کو پلکوں سے اس نے چُنا

نہ جذب وفا کا لہو گرم ہے
نہ آنکھوں میں اپنی کوئی شرم ہے

ؒ/ پتھروں میں جو دوسرا حرف مشدد ہے اسے ضرورتاً "غیر مشدد باندھا ہے۔ اہل فن سے معذرت

سوویٹ یونین ہے کہیں بے چراغ
سٹالن کا ملتا ہے کوئی سراغ!

ہوئی کہکشاں آج چہروں کی خاک
تو دامن ہوئے آج چہروں کے چاک

جو یادوں کے جگنو چمکنے لگے
تو آنکھوں میں آنسو دمکنے لگے

قصیدہ نہ تھا لب پہ رخسار کا
نہ منظر تھا آنکھوں میں گلزار کا

میں شاعر ہوں اپنی روایات کا
مفسّر ہوں اپنی حکایات کا

نہیں ہے کسی پہ یہاں اعتبار
جفاؤں کا کس کس کی ہوگا شمار

نہیں بام و در پر کوئی روشنی
نہ آنگن میں رقصاں کوئی چاندنی

جو ڈسنے لگی مجھ کو موجِ نفس
نشیمن بھی مجھ کو لگا ہے قفس

نہ آیا کسی کو کسی پر ترس
کہ ہے مال و زر کی جہاں میں ہوس

۱۔ اسٹالن سوویت یونین کا سابقہ سربراہ

یہ ہے رحم دنیا کے مزدور پر
ستم گر کا سکّہ ہے جمہور پر

نہ قوسِ قزح میں ہیں انگڑائیاں
نہ کانوں میں بجتی ہیں شہنائیاں
نہ رقصاں تمنّا کی پرچھائیاں
ہر اک سمت پھیلی ہیں رسوائیاں

نہیں آتشیں کوئی چہرہ یہاں
کہ نظروں میں ہے اک سلگتا جہاں
ہیں وحشت کی سانسوں میں اب آندھیاں
نہ بے خواب آنکھوں میں بینائیاں

ملی تھیں جو مفلس کو آزادیاں
مُقدّر میں تھیں ان کے بربادیاں

خروشیف[۱] ہارا ہے اس دور میں
کرے بات کس سے یہاں شور میں
جو مقتل میں اب قتلِ خورشید ہے
یہ رسمِ جفا ہی کی تقلید ہے

نہ گونجا ہے نغمہ جنوں کا کہیں
نہیں ہے نشاں اب فسوں کا کہیں

۱۔ خروشیف ۔ ماضی میں سوویٹ یونین کی قد آور شخصیت

کہیں پر نہیں ہے پیامِ فراغ
چھپائے ہیں لوگوں نے زخموں کے داغ
جو حسرت کی تقدیر دیکھی ہے آج
تو خوابوں کی تعبیر دیکھی ہے آج

مُدبّرِ نے ایسے بجھائے چراغ
کہ ملنا ہے مشکل خودی کا سُراغ
مُفکّر نے گھولا ہے کچھ ایسا زہر
اجل بن رہا ہے نگاہوں میں دہر

چڑھائے جہاں پر عقیدت کے پھول
اُڑی ہے وہاں آج نفرت کی دھول
نہ بھڑکا کوئی بھی سلگتا چراغ
چلا ہے کسی کا نہ اب تک دماغ

نہیں ہم میں کوئی بھی زندہ ضمیر
کہ ہاتھوں میں رقصاں ہے خونیں لکیر
نہیں کوئی مقتل کی جانب رواں
ہے بے خواب آنکھوں میں اندھا دھواں

ہیں سرمایا داروں کے ہم بھی سفیر
نہ جانے ہیں کب سے ہم ان کے اسیر
لکیروں میں ہاتھوں کے ہے مردہ فن
نہ اس پر کوئی آنسوؤں کا کفن

ہے خونخوار بپھرا ہوا زر کا سانڈ
ہے محشر نما آج لینن گرانڈ
کہ خارج ہوا جب سے لینن برانڈ
ہوئی اشتراکی حکومت بھی رانڈ

فلک بوس بُت بھی زمیں دوز ہیں
یہ ہنگامے برپا شب و روز ہیں
فلک بوس بت جب گرائے گئے
سرِ عام محشر اٹھائے گئے

نہیں مارکس[1] کی کوئی فکرِ رسا
نہ بھائی زمانے کو اس کی ادا
جو آنکھوں سے مارکس اوجھل ہوا
تو ذہنِ جہاں آج بوجھل ہوا

ہوا گورکی[2] بھی یہاں در بدر
مُیسّر نہیں سر چھپا کے گھر
زمانہ ہے ایلگز[3] سے اب بدگماں
میسر نہیں اس کو جائے اماں

1۔ کارل مارکس

2۔ گورکی

3۔ ایلگز انقلاب روس کے اشتراکی نظام کو پروان چڑھانے والے

تھا لینن[1] کی آنکھوں میں سیلاب اشک
کسی حکمران کو نہیں اس پہ رشک
ہوئی ٹالسٹائی[2] کی تحریر خاک
گریباں ہے قرطاس کا آج پاک

جو لوگوں نے مسلے مُروّت کے پھول
ہے آنکھوں میں پشکن[3] کی حسرت کی دھول
جو بے دست و پا آج چیخوف ہے
ہر آمر یہاں آج بے خوف ہے

ہر اک فلسفہ تھا یہاں اشک بار
ملا ٹالسٹائی بھی سینہ فگار
جو اردو ادب کا بھی نقّاد ہے
سخاچوف[4] وہ آج ناشاد ہے

تھا ماضی کبھی روس کا تابناک
اُڑی حال میں اس کی عظمت کی خاک
ہے صدمے سے دوچار روسی عوام
نہیں ان کے ہاتھوں میں اپنی لگام

جو تاریخ کا اب جریدہ ملا
تو اس میں قلم سر بُریدہ ملا

---

1. لینن ۔ 2 ٹالسٹائی ۔ 3 پشکن ۔ 4 سخاچوف سوویت یونین میں اردو ادب کے محقق و نقاد

جو بجتا تھا ڈنکا مساوات کا
مخالف رہا وہ روایات کا
زباں پر جو لوگوں کی پہرا لگا
ہر اک زخم سینے میں گہرا لگا

مساوات بھی غیر فطری رہی
بغاوت سینے میں گہری رہی
جو لوگوں کی نقلِ مکانی ہوئی
تو نفرت کی شعلہ فشانی ہوئی

نہیں اشتراکی ممالک میں شور
جو رخصت ہوا ان کا دنیا سے زور
جو نفرت کی سر پر کڑی دھوپ ہے
تو بے رنگ لوگوں کا ہر روپ ہے

جہاں میں ہے اس کا بڑا شور آج
کہ ہے اشتراکی لبِ گور آج
ہیں علم و ادب کے جو محور عوام
وہ رہتے ہیں دنیا میں پھر بھی غلام

ہے تُربت کا کتبہ جو ہاتھوں میں آج
اجل کو بھی دینا پڑے گا خراج

ملا والٹیئر[1] غم کے طوفان میں
پریشاں ہے جبران[2] لبنان میں
ہے روسو[3] کی تحریر کیوں بے زباں
نہیں [illegible]
جو روسو بھی آئینہ صورت ملا
وہ آنکھوں کو تحریر تربت لگا
جو توڑا ایلن پو[4] نے خوب قلم
ہیں پاؤنڈ[5] کی آنکھوں میں رنج و الم
ملا ایلیٹ[6] بھی یہاں سوگوار
گلستاں میں دیکھی جو زخمی بہار
ہے فکر و نظر کا جواب معمہ
نہیں اس پہ میرا کوئی تبصرہ
جو بدلا ہے اب اشتراکی نظام
تو مفلس ممالک ہیں زر کے غلام

1۔ والٹیئر ۔۔۔ انقلاب فرانس میں نمایاں کردار ادا کیا۔

2۔ خلیل جبران ۔۔۔ لبنان

3۔ روسو ۔۔۔ انقلاب فرانس میں نمایاں کردار ادا کیا۔

4۔ ایڈگر ایلن پو ۔۔۔ امریکی دانشور

5۔ پاؤنڈ ۔۔۔ امریکی دانشور

6۔ ایلیٹ ۔۔۔ امریکی دانشور

نہیں جہل کا ہم کو عرفان کوئی
نہ صحرا میں ہے آبِ حیواں کوئی

جو آئینہ خانہ ہے دورِ جہاں
نظر آئے گا اس میں ہر امتحاں

بلاِ فائدہ انقلابِ فرانس
نہیں تھا کسی کو بھی جینے کا چانس

جو ٹھہرے تھے دنیا میں معمارِ فکر
نہیں ہے زمانے میں اب ان کا ذکر

ہے جاری ابھی جدلیاتی عمل
سُپر طاقتوں کے بھی نکلیں گے بل

ہے عرفاں ہی جب عظمتوں کا امین
نہیں آخری یہ زمانے کا سین

جو تاریخ کروٹ بدلنے کو ہے
نئے رخ پہ انسان چلنے کو ہے

نیا آسماں ہوگا افکار کا
بلندی پہ سر ہوگا فنکار کا

ملے گا جب انساں کو جائز مقام
ہر اک کا بڑھے گا یہاں احترام

سفر میں ہے انسانیت کا شعور
یہ منزل پہ پہنچے گا اپنی ضرور

جو بدلا جہاں میں سماجی نظام
وہ کرتا ہے کب تک یہاں پہ قیام

نیا سماجی ہے جو زر کا نظام
ہے مغرب کا اس میں بڑا اہتمام
وہ مشرق کو رکھیں گے اپنا غلام
نہ ہوگا کوئی ایشیا کا مقام
پڑا شرقِ وسطیٰ سے مغرب کو کام
وہ کردیں گے قِصّہ یہاں کا تمام

بصیرت سے جو لوگ محروم ہیں
وہ مغرب کے خادم و مشؤم ہیں

جو مسلم ممالک بنائیں بلاک
تو مغرب کرے گا اسے بھی ہلاک

ہر اک ملک کے ہیں مسائل الگ
ہیں اک دوسرے سے وسائل الگ

جو مسلم ممالک کریں اتحاد
تو کرنا پڑے گا انہیں بھی جہاد

رہے ذہن میں جو اُخوّت کی یاد
اسی میں ہے پوشیدہ سب کا مفاد

حقائق کا گر تجزیہ چاہیے
مُفکّر کو زیرِ نظر لائیے

مُعلّم کا علم و ہنر چاہیے
مُحقّق کا خونِ جگر چاہیے
جو ہے تجزیئے کی ضرورت تمہیں
وہ ہر لمحہ دے گا بصیرت تمہیں

نہ ہوگا کوئی کام اس کے بغیر
ملی علم ہی سے زمانے کو خیر
ہے سقراط کا یہ زمانے میں قول
نہیں علم کا کوئی دنیا میں مول

کروں گا میں صفدر یہاں اجتہاد
ضروری ہے فکر و نظر میں جہاد
ہے ذکرِ امن ہی بڑا دہر میں
کہ مجلس کا قِصّہ بڑھا دہر میں

ہے رقصاں لہو نوکِ شمشیر پر
برستا ہے خوں آج کشمیر پر
جو توقیر تیری تماشا بنی
وہ ماحول کا آج لاشا بنی

ہے اقوامِ عالم کا مردہ ضمیر
وہ ہے سیم و زر کا جہاں میں اسیر
دیا ہے لہو اب جو شمشیر کو
مجاہد ہی چھینیں گے کشمیر کو

کہاں فیصلہ ہے فلسطین کا
سنا کس نے قصہ ہے غمگین کا
فلسطین ہے مصلحت کا شکار
کہ ہے مجلسِ امن خود بے وقار
کہ دیکھی ہے تاریخ نے وہ بہار
سُپر طاقتوں کو کہاں تھا قرار
میں کرتا ہوں قِصّہ کا اب اختصار
بیاں میں نہیں ہے مجھے کوئی عار
نہیں امنِ مطلق بھی لبنان میں
نہیں ہے اثر کوئی وجدان میں
جو ایران سب کا طرفدار ہے
زبانوں پہ افغاں کے للکار ہے
سُپر طاقتوں میں توازن نہیں
کسی مرد آہن کی سن گن نہیں
ہے ایواں، مگر بیخ اور بنُ نہیں
کسی کو بھی اصلاح کی دھنُ نہیں
کسی کا یہاں صاف دامن نہیں
نظر میں کوئی آج مامن نہیں
فلک پہ نہ گزرا کوئی ماہ تاب
نہ آنگن میں اترا کوئی آفتاب

کسی بام و در پر نہیں روشنی
کسی گھر میں رقصاں نہیں زندگی
نہ خورشید میں اب تمازت کوئی
نہ پھولوں میں باقی لطافت کوئی

نہ رقصاں دلوں میں کوئی آرزو
نہ باقی نظر میں کوئی آبرو
نہ مفلس رہا ہے کوئی سرخ رو
نہ جینے کی دنیا میں ہے جستجو

جنہیں سیم و زر نے ہے پالا یہاں
انہیں سازشوں میں ہے ڈھالا یہاں
کسی نے کسی کو سنبھالا نہیں
نظر میں کسی کے اُجالا نہیں

کوئی روشنی اب ملوں میں نہیں
تمنائیں رقصاں دلوں میں نہیں
کہاں رہ گئی ایشیا کی دلہن
نہ ہم میں ہے باقی کوئی بانکپن

غریبوں کا اب کوئی محور نہیں
کسانوں کا کوئی مُقدّر نہیں
سیہ بخت ٹھہرے ہیں مفلس یہاں
ملے گی نہ ان کو کہیں بھی اماں

نظر کی بھی شمعیں بجھا دی گئیں
صفیں غم کی گھر گھر بچھا دی گئیں
جو شمعیں تھیں زر کی جلا دی گئیں
غموں کی سبیلیں لگا دی گئیں

یہاں زیست کا کوئی عنواں نہیں
سرِ بزم اب کوئی دھقاں نہیں
جو مفلس کی قسمت بھی کھوٹی ہوئی
برہنہ کسی سر کی چوٹی ہوئی
جو ایمان وگوں کا روٹی ہوئی
بدن کی یہاں بوٹی بوٹی ہوئی

جو پازیب میں آج جھنکار ہے
لہو میں ہوس کی وہ پھنکار ہے
جو چاندی کے سکوں میں آکر ڈھلی
وہ دیوی بھی مٹی میں آکر ملی

جو لاشوں سے دیوار زر ہے چُنی
سرِ شام جھنکار اس کی سُنی
جسے آج جشنِ طلائی ملا
وہ زر پوش ہو کر کلائی ملا

تمنائیں ہیں آج سہمی ہوئیں
کہ ہیں عبرتیں آج کھوئی ہوئیں

نہ آنکھوں میں رقصاں ہے جادو کوئی
نہ ساون میں آیا ہے سادھو کوئی
لہو سے جو رنگین تصویر ہے
وہ فکر و نظر ہی کی تحریر ہے

قلم کا نہیں ہے کوئی معجزا
لبوں پر صحافت کے ہے اک دعا
اذانِ سحر گونجتی ہیں یہاں
خموشی ہی در کھولتی ہیں یہاں

جو ذلّت کا کوئی کچوکا نہیں
کسی نے کسی کو بھی ٹوکا نہیں
جو روحیں یہاں آج نیلام ہیں
بدن کے وہ طوفاں بھر گام ہیں

ہوا جسم رُسوا جو بازار میں
تو روحوں کی بولی ہے دربار میں
تجارت سیاست کی آئی نہ راس
کہ رُکتا ہے غریب کے سینے میں سانس

ہوا آج رائج جو زر کا نظام
چھلکنے لگے پھر سے محفل میں جام
ہوئے آج سیدھے جو سرکش غلام
تو لرزے ہیں وہ سن کے آقا کا نام

ملا ہے خروشیفؔ[1] بھی پُر ملال
نہیں اس کی آنکھوں میں کوئی جلال
ممالک ہیں مغرب کے سب باکمال
کہ مشرق میں لائے ہیں گھر گھر زوال

چلی ہے زمانے میں کچھ ایسی چال
کہ آیا ہے شیشوں میں آنکھوں کے بال
فلسطین و کشمیر پر ہے نظر
کیا بند انصاف کا ان پر در

وہ آزادیوں کی کہاں ہے سحر
زبانوں پہ ہے ذکر اس کا مگر
اچھالے تھے جس نے یہاں تخت و تاج
وہ دینے لگا ہے لہو کا خراج

یہ قوموں کی دنیا میں تاریخ ہے
جو ہر عہد و پیماں کی تنسیخ ہے
جو اُلٹا ہے تاریخ نے اب وَرق
تو دل ہوگیا نوعِ انساں کا شق

سہ ا خروشیف ۔ ماضی میں سوویٹ یونین کی قد آور شخصیت

چلی ہے جو متراں[1] و میجر[2] نے چال
یہ لگتا ہے بیکر[3] کا سارا کمال
جو آیا ہے عراقیوں پر زوال
نہ اس پر کسی تبصرے کی مجال

عراقی ہوئے ہیں کچھ ایسے ذلیل
نہ ان کا ہے دنیا میں کوئی وکیل
مسلماں نے مغرب کو دی ایسی ڈھیل
کہ گاڑی ہے تابوت میں ان کے کیل
نہ تھا ان میں کوئی بھی مردِ خلیل
جو لاتا جہاں میں مدلّل دلیل

یہ ہے حکمرانوں کی دنیا میں چال
نہ آئے زباں پر کسی کے سوال
لگا ہے خروشیف[4] بھی کچھ نڈھال
کو سیجن[5] نے دیکھے عروج و زوال

1۔ مغراں (متراں) ـــ صدر فرانس

2۔ جان میجر ـــ وزیراعظم برطانیہ

3۔ جیمس بیکر ـــ وزیر خارجہ امریکہ

4۔ خروشیف ـــ سابقہ سوویت یونین کی قد آور شخصیات

5۔ کوسیجن

نہ تھا میسولینیؒ[1] کا جاہ و جلال
کہ آنکھوں میں رقصاں تھا اس کے ملال

نہ تھا چائنہ غیر جانب وہاں
کہ جاپان تھا اپنا راغب وہاں

جو اُترے بغاوت پہ چینی عوام
حکومت نے ان کا کیا قتل عام

چلائے گئے ان پہ بے خوف ٹینک
نہ باقی رہا ان کا دنیا میں رینک

جو حامی تھے جمہوریت کے وہاں
کسی نے نہ دی ان کو جائے اماں

ہے سوشل ازم جس کا دنیا میں دین
وہ روئے زمیں پر ہے اک ملک چین

جو تھیں ہیروشیما کی آبادیاں
مقدر میں تھیں ان کے بربادیاں

کہ نظروں میں جن کے یہ منظر رہا
انہوں نے بھی ہاتھوں میں خنجر لیا

نہ تھا اپنے موقف میں صائب کوئی
نہ موجود دھرتی پہ راہب کوئی

1۔ میسولینی

ہر اک سمت چھایا ہے خوف و خطر
نہیں ہے تباہی سے پھر بھی حذر
بنا ہے جو دنیا کا اب محتسب
سپر طاقتوں کا ہے وہ منتخب

عدالت بنائی ہے جو عالمی
خبر اس کی آئی ہے دو کالمی
نہیں فیصلہ جس کا نافذ کہیں
ہے پس ماندہ قوموں کی زخمی جبیں

نہ قانون کا اس کے حافظ کوئی
نہ مظلوم کا ہے محافظ کوئی
لُغت کے بکھیڑوں میں پڑتا نہیں
کسی لفظ پر میں جھگڑتا نہیں

نہ خوفِ خدا اور نہ اپنوں کا ڈر
کہ ہے سیم و زر پر ہر اک کی نظر
جنہیں لوگ کہتے ہیں اب مغربی
وہ قول و عمل میں ہیں کچھ مشرقی

زمانے کا نقشہ ہے بدلا ہوا
ہر اک شخص ہے آج سہما ہوا
حکومت ہوئی جس کی زیر و زبر
نہیں ہے کہیں بھی وہ شیرِ و شکر

بڑی طاقتوں کا جو گٹھ جوڑ ہے
یہ نازک سا دنیا میں اک موڑ ہے
یہاں پر اُٹھیں گے بڑے قافلے
رہیں گے ممالک میں کچھ فاصلے

تہلکہ مچایا جو ایران نے
اٹھایا ہے پرچم بھی افغان نے
حکومت بنے گی جو اسلام کی
ضرورت نہ ہوگی کسی رام کی

جو کشمیریوں نے بڑھایا قدم
لیا ہاتھ میں سب نے اپنے علم
ہے قبضہ جو اب ان کا شمشیر پر
حکومت کریں گے وہ کشمیر پر

نہ مانگیں گے اپنے کسی سے حقوق
وہ چھینیں گے اپنے سبھی سے حقوق
ہوئے ہیں فلسطینیوں پر ستم
نہ ان پر کسی نے کیا ہے کرم

حکومت بنے گی فلسطین کی
حمایت ہے حاصل اسے چین کی
نئی مملکت کا ہوا ہے ظہور
مسلماں کو اس کا ہوا ہے شعور

نہ پھیلے گا اب کاشغر میں فتور
جو آنکھوں میں آیا مسلماں کے نور

جو اترا ہے اب آن کر جھیل پر
وہ اترے گا کب ساحلِ نیل پر

زباں پر رہا ذکر اقبالؔ کا
نہیں بے ثمر فکر اقبالؔ کا

جو مغرب نے کھولا ہے اپنا محاذ
ہے اس کی نگاہوں میں مرکز حجاز

فضا میں اڑاتے ہین شاہین و باز
جھکاتے ہیں سر کو بوقتِ نماز

سعودی عرب ہے جو سونے کی کان
اسی سے ہے قائم مسلماں کی آن

نہیں جس کی حکمت کوئی خارجہ
نمایاں ہے ملکوں میں وہ شارجہ

فلک بوس ہے ہر عمارت یہاں
بلندی پہ ہے ہر سفارت یہاں

ہیں شیشے کی مانند سڑکیں یہاں
غریبوں کا اس پر گزر ہے کہاں

ہیں رنگین آنچل زمیں آسماں
گلستاں ہے رقصاں زمیں پر یہاں

یہاں کی زمیں پر بکھرتے ہیں پھول
غریبوں کی آنکھوں پہ کاروں کی دھول

جو دامن پہ رقصاں ہیں شمس و قمر
اترتی ہے آنگن میں زر کی سحر

زبانوں پہ ہے وِرد آیات کا
تو ذہنوں پہ سکّہ امارات کا

نظر میں ہیں میری یہ دنیا و دیں
کہ زخمی ہے سجدوں سے میری جبیں

فقیہوں کی آنکھوں میں رقصاں غرور
نمازوں میں ان کی نہیں ہے سرور

محبّت کے چرچے سرِ عام ہیں
خلوص و وفا آج بدنام ہیں

نبیؐ سے نہیں ہے لگاؤ کوئی
نہ گردن میں باقی جھکاؤ کوئی

حکومت ہے سب کو یہاں پر عزیز
عقیدہ بھی رہتی ہے اس کے کنیز

نہ اسلام سے ہے محبّت کوئی
نہ آنکھوں میں رنگِ مروّت کوئی

جو آئیں ہیں مسلم ممالک سے لوگ
وہ کرتے ہیں ماضی پہ کیوں اپنے سوگ

برہمن سمجھتا ہے خود کو بلند
کہ علم و ہنر کے ہیں دروازے بند
میں سمجھا جسے موتیوں کا صدف
وہ مجھ سے ملا آج خنجر بکف

میں دستِ مروّت بڑھاتا رہا
وہ قدموں کو پیچھے ہٹاتا رہا
یہ تاریخ کے ہیں نشیب و فراز
کہ منصب پہ محمود کے ہے ایاز

فلک بوس ہے جو یہاں مقبرہ
تو دھرتی کرے اس پہ کیا تبصرہ
ہے روئے زمیں پر جو برپا فساد
نہ باقی رہیں گے ثمود اور عاد

جو مشہور ہے اب بنامِ شریف[1]
نہیں ہے حکومت بھی اس کی نحیف
جو ارض وطن میں ہے سب کو عزیز
وہ کرنے لگا خیر و شر میں تمیز

جو ہے آج لوگوں میں بندہ نوازؔ
تصرف میں اس کے ہیں شاہین و باز

۱۔ م۔ نواز شریف وزیر اعظم پاکستان

جو اترا ہے اب روحِ شاہین میں
وہ لایا ہے ترمیم آئین میں
رہے گا یہاں امن کا گر چلن
ترقی کرے گا ہمارا وطن

جو دستِ اجل میں نہ ہوگا قلم
تو قانون کالا نہ لے گا جنم
وسائل پہ اپنے کرو انحصار
ملے گا زمانے میں تم کو وقار

جو مِلّت کا جمہورِ خورشید ہے
اسی سے تو مِلّت کو امید ہے
وفا جو نہیں کرتے جمہور سے
اٹھاتے ہیں نقصاں وہ مجبور سے

فریبِ نظر ہے وہ جمہوریّت
کہ مفلس کو جس میں نہ ہو اہمیّت
جو قانون کی بالا دستی نہیں
تو پھر قوم و مِلّت کی ہستی نہیں

جو آئی ہے انگلی پکڑ کر اجل
نہیں تیوری پر مری کوئی بل
نہیں سانس میں جبکہ موجِ ہوا
برہنہ بدن کو ہے درسِ حیا

جو لوح و قلم کے خریدار ہیں
وہ میرے زمانے کے فن کار ہیں
قدم جن کے راہوں میں رُکتے نہیں
کسی موڑ پر بھی وہ جُھکتے نہیں

نہ شبنم سے بجھتی ہے پیاسوں کی پیاس
ہُوا بوجھ غم میں خوشی کا لباس
سحر تاب کوئی اشارہ نہیں
کہ جھولی میں کوئی ستارہ نہیں

لبوں پر نہیں کوئی برگِ گلاب
نہ کانوں میں کوئی صدائے رباب
نہ آنکھوں میں کوئی گزیدہ حجاب
نہ سر پر ہمارے ہے کوئی سحاب
نہ ظلمت میں بیوہ کے قدموں کی چاپ
تبسّم کو اس کے سمجھتے ہیں پاپ

نہ آنکھوں میں چمکی سجیلی کرن
نہ سینے میں رقصاں رسیلی کرن
نہیں چُوڑیوں میں بھی کوئی کھنک
نہ سیندور کی مانگ میں ہے دھنک

میں رکھتا ہوں دنیا میں جینے کی آس
جلا دوں گا میں بے بسی کا لباس

نہ وجدان صفدر کا بے نام ہے
نہ افسوں ہے وہ اور نہ الہام ہے

میں ماضی کی باتوں پہ نادم نہیں
سپُر طاقتوں کا میں خادم نہیں

میں خوابوں کی دنیا کا شاعر نہیں
میں الفاظ و معنی میں ماہر نہیں

کسی سے نہ محفل میں محجوب ہوں
نہ اپنے زمانے کا مجذوب ہوں

نہ اپنے وطن سے میں مایوس ہوں
میں ظلمت کی بانہوں میں فانوس ہوں

جو نظروں میں تاریخ انساں ہے آج
وہ ہاتھوں میں اک نبض دوراں ہے آج

جو خوابوں کی دلہن لبِ بام ہے
وہ رقصاں نظر میں سرِ عام ہے

جو ارضِ وطن کا ہے لوگوں پہ فرض
ضمیروں پہ ٹھہرا ہے وہ آج قرض

جو تاریخ کا ہم کو عرفاں نہیں
کسی درد کا اپنے درماں نہیں

نئی نسل سے اب مخاطب ہوں مَیں
دل و جان سے اس کی جانب ہوں میں

یہ ارضِ وطن تیری پہچان ہے
حقیقت میں یہ جان و ایمان ہے
رگوں میں ہے اس کے جو خونِ جگر
بزرگوں کی محنت کا ہے یہ ثمر

جو قائد کی باتوں کو تم جان لو
دل و جان سے ان کو پھر مان لو
مُقدّس یہ ورثہ بزرگوں کا ہے
یہ قِصّہ بھی ماضی کے پُرکھوں کا ہے

یہ خوابوں کے ریزوں سے قائم ہوا
لہو سے بزرگوں نے دائم کیا
امن کا عقیدہ ہے اُمّت کی جان
مُحبّت کا رشتہ ہے اُمّت کی جان

نئی نسل کا یہ فریضہ ہے اب
رہیں ملک میں اپنے مل جل کے سب
ہے خونِ جگر ہے گلوں میں بہار
کہ علم و ہنر سے ہے سب کا وقار

زباں پر نہ حرفِ شکایت رہے
نہ ماضی کی لب پر حکایت رہے
سروں پر ہوا جس کا سایہ فگن
وہ اپنا وطن ہے، وہ اپنا وطن

میں اپنے وطن سے نہیں بے خبر
کہ راہوں سے لوگوں نے کاٹے شجر
جو لڑتے ہیں آپس میں اہلِ مکیں
نہیں ان میں باقی کوئی دُور بیں

اصولِ وطن ہیں یہاں بے وطن
صلیبِ بہاراں سے رنگیں چمن
سیاست کے ہاتھوں جو کھائے فریب
تو خالی ہوئی ہے امانت سے جیب

جو ہیں سرد ذہنوں میں اپنے اصول
کتابوں میں لگتے ہیں وہ مردہ پھول
افق پر نہیں ہے کرن کی نمود
نہ ادراک کا ہے کہیں پر شہود

چمن میں کوئی رنگ و نکہت نہیں
گلوں کی یہاں کوئی قیمت نہیں
بساطِ سیاست اُلٹ جائے گی
یہ اندھی عقیدت بھی ہٹ جائے گی

اماں ہو مُیسّر کہاں دہر میں
کہ انصاف بکتا ہے ہر شہر میں
دھماکوں کا رہتا ہے ذہنوں پہ خوف
نئی نسل کا ہے بزرگوں پہ خوف

ممالک ہیں جو بھی ترقی پذیر
بڑی طاقتوں کے ہیں وہ بھی اسیر
بساطِ سیاست پہ مہرے ہیں وہ
بصیرت کی دنیا میں کورے ہیں وہ

تقاضے ہوں پورے اگر عدل کے
نہ چرچے رہیں ملک میں قتل کے
عدالت نہ ہو گر کسی کی فریق
وہ مظلوم کی ہو سراسر رفیق

جو تابع ہو آئین زر دار کا
تو لونڈی ہو قانون سردار کا
عدالت ہی مقتل ہو جب دہر میں
تحفّظ نہ ہوگا کسی شہر میں

جو ووٹوں سے سب کا بھرم اٹھ گیا
دلوں کا زمیں سے حرم اٹھ گیا
لٹیروں کا، غنڈوں کا ہے اقتدار
لہو کا ہے آنکھوں میں ان کی خُمار

نہ سڑکوں پہ ہے کوئی محفوظ آج
کہ لیتے ہیں غنڈے ہر اک سے خراج
سپاہی کسی کا محافظ نہیں
قوانین کا اپنے حافظ نہیں

ہے رشوت ہی ہر چیز کی اب کلید
یہ سکہ مرے دور کا ہے جدید
کھلونا ہے قانون زردار کا
بڑا نام ہے آج سرکار کا

ہے صنعت کا چرچا بڑا دہر میں
کہ لٹتا ہے مفلس ہر اک شہر میں
زمینداریوں کو ملا ہے فروغ
کہ نوکِ زباں پر ہے جاری دروغ

ملاوٹ ہی اب جزوِ ایمان ہے
لٹیرا ہی سڑکوں پہ انسان ہے
نہیں افسروں کو بھی دفتر میں کام
کہ رقصاں ہے رشوت کا ہاتھوں میں جام

ہے فرقہ پرستی کا پرچار اب
عقیدے کی حائل ہے دیوار اب
نہیں ہے یہاں کوئی تعمیر فکر
نہ پیش نظر کوئی تطہیر فکر

نہ سینے میں ہے اپنے قلبِ سلیم
نہ ہاتھ آئی اپنے رہِ مستقیم
افق پر ہے اب مغربی آفتاب
نہیں ہم میں باقی کوئی بو تراب

جو مسلم ممالک ہیں اب زیرِ دام
مُیسّر نہ ہوگا سکون دوام
مسلماں کی کوشش ہوئی نا تمام
کہ خالی ہے شمشیر سے اب نیام

حقائق سے رہتے ہیں ہم بے خبر
کہ ہم میں نہیں ہے کوئی خُود نگر
یہ عالم نہیں ہے کوئی ساز گار
دل و ذہن پر ہے زمانے کا بار

نیا لا رہے ہیں جو اپنا نظام
بنائیں گے سب کو وہ اپنا غلام
جو بن جائیں وہ میکدے میں امام
نہ باقی رہے گا حلال و حرام
جو ہے آج جمعیّت اقوام کی
وہ قرطاس پر ہے فقط نام کی

یہاں پر جو مغرب کی تقلید ہے
تو اقوامِ مشرق پہ تنقید ہے
جو مشرق کی دختر ہے اب بے حجاب
تو ہاتھوں میں ہے اپنے چنگ و رباب

نہیں ہیں مُقدّر میں گر علم و فن
نہ پھولے پھلے گا ہمارا وطن

نہیں ہے ہمارا کوئی ہم نشیں
نہ مہتاب اپنا ہے نور آفریں
نہ صحرا میں ہے کوئی آب حیات
نہ آنکھوں میں رقصاں کوئی کائنات

نہ شاعر میں باقی ہے ذوق حیات
زمیں پر ہے رقصاں اجل کی برات
یہ دھرتی پہ ہیں کیسے لیل و نہار
کسی کو میسّر نہیں روزگار

بدلنے کو ہے اب جہاں کا نظام
یہ ہے آخری اب خزاؤں کی شام
اندھیروں کے بادل بھی چھٹ جائیں گے
فریبوں کے پردے بھی ہٹ جائیں گے

نئے موسموں کا گزر ہے یہاں
نئی منزلوں کا سفر ہے یہاں
بنے گا جو مٹی کے ذروں سے طور
تو چھلکے گا آنکھوں سے الفت کا نور

سیاست کی سازش نہ ہوگی کہیں
کہ نفرت کی بارش نہ ہوگی کہیں
جو آنے کو ہے اب سحر کا نقیب
وہ ہوگا زمانے کا اپنے ادیب

جو ہے بابِ ہستی بھی پیشِ نظر
ہر اک پر کھلے گا مُحبّت کا در

مُحبّت کا جو حرفِ تمہید ہے
خلوص و وفا کی وہ تجدید ہے

برہنہ بدن کو ملے گا لباس
نہ خالی ملے گا کسی کو گلاس

اذان سحر سے جگائیں گے لوگ
مساجد میں سر کو جھکائیں گے لوگ

غمِ تیرگی بھی نہ ہوگا یہاں
غمِ بے بسی بھی نہ ہوگا یہاں

نہ ہوگی یہاں بے یقینی کی دُھول
نہ انسان ہوگا کوئی بے اُصول

یہ گلیاں یہ کوچے بدل جائیں گے
یہ گمراہ انساں سنبھل جائیں گے

نہ ہوگی طوائف کسی شہر میں
نہ انساں بِکیں گے کہیں دہر میں

جو محنت کشوں کی ہے یہ سرزمیں
وہ ہے ہر نفس کی یہاں پر امیں

جو لب پر مرے آتشیں گیت ہے
خلوص و وفا کی یہی ریت ہے

مرا ملک ہے شاعری کی زمیں
گلستاں گلستاں ہے اس کا حسیں

نہ ہوگا زمیں پہ بنی سامری
نہ فن کار ہوگا کوئی آذری

یہ خوابِ گراں بھی گزر جائے گا
یہ دفتر خزاں کا بکھر جائے گا

نہ وادی میں ہوگا اندھیرا کہیں
کہ ہونے کو ہے اب سویرا کہیں

ہر اک شخص ہوگا شریکِ سفر
کہ رہتی ہے منزل پہ سب کی نظر

جو ہاتھوں میں ہے حُریت کا علم
تو ہر خواب لگتا ہے اب محترم

جو ہاتھوں میں اب میرے آئین ہے
تو قلب و نظر کی وہ تزئین ہے

نگاہوں میں رقصاں ہے عزم و یقیں
کہ ہے رشکِ فردوس میری زمیں

یہ ارضِ وطن سب کی تنویر ہے
یہ ماضی کے خوابوں کی تعبیر ہے

ہے ملکِ خداداد اپنا وطن
نہ آلودہ ہوگا خزاں سے چمن

رقم لوحِ دل پر جو روداد ہے
وہ ہر لمحہ دل میں ہمیں یاد ہے
یہاں چاند کرنیں لٹاتا رہا
ستارہ یہاں جگمگاتا رہا

یہاں چاند بھی زیرِ فرمان ہے
یہاں کہکشاں زیرِ دامان ہے
جُھکے اس زمیں پر کئی آسماں
کہ مہتاب و انجم ہیں اس کے نشاں

ملی ہے ہمیں روشنی کی زباں
جھلکتا ہے ہر فن میں زورِ بیاں
صداقت کا جو آج منشور ہے
وہ ظلمت میں اک آیۂ نور ہے

لبوں پر جو کلمہ ہے توحید کا
جلایا دِیا پھر سے اُمیّد کا
لبوں پر ہیں رقصاں امیدوں کے گیت
ہمارے مُقدّر میں لکھی ہے جیت

ہیں ماضی کی عظمت کے ہم سب امیں
رُخِ حال پر ہم ہیں مہرِ یقیں
قلم کی نظر میں ہے لوحِ جبیں
نگاہوں میں رقصاں ہیں منظر حسیں

جو مسلم ممالک سمٹ آئیں ہیں
مسائل سے اپنے نمٹ آئیں ہیں
نظر میں نہ آیا تھا ایسا سماں
یہ مومن کا نقشا تھا ہر و جہاں

جو مقصد ہو سب کا یہاں مشترک
نہ ہوگا کسی کو کسی پر بھی شک
جو آپس میں ہو جائے اک اتحاد
مُیسّر ہو مِلّت کو پھر اعتماد

بنے گا مرا دور جب عہدِ ساز
اُڑیں گے فضاؤں میں شاہیں و باز
جو خاکِ وطن ہوا ہمارا کفن
ہلالی رہے گا ہمارا چمن

اُخوّت کا ہو جائے سب میں چلن
مُسرّت کا پھر لہلہائے چمن
کبھی دامن خواب چھُوٹا نہیں
تو افسوں مُحبّت کا ٹوٹا نہیں

جو امن و اماں کا سپاہی ہوا
اُخوّت کی راہوں کا راہی ہوا
یہ ہے سوچنا اب کسی کا فضول
کہ اترے گا کوئی فلک سے رسول

محمدؐ پہ اترے جو بے مثل اصول
کرو جان و دل سے انہیں تم قبول

یہ عالم خزاں کا بدل جائے گا
کہ گر گر کے انساں سنبھل جائے گا

ہوا الجزائر میں جو انتخاب
چکایا ہے ماضی کا اس نے حساب

جو پھر سے اٹھایا ہے میں نے قلم
حقائق کو خوں سے کیا ہے رقم

ہے صفدر کی آنکھوں میں رقصاں غزل
کھلیں گے محبّت کے دل میں کنول

"آشوبِ میکدہ"

جناب پروفیسر ڈاکٹر صفدر حسین صفدؔر کی طویل نظم پر میں نے نظر ڈالی۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اس فکری اور فکر انگیز نظم کے مطالعے کا حق ادا کیا ہے۔ شعر کے ساتھ میرا رشتہ کچھ ایسا ہے کہ میں کسی شاعر یا نظم یا مجموعے کے ساتھ اپنا خاصا وقت گزارتا ہوں۔ یہ وقت ہم نشینی کی ادائیں رکھتا ہے اور یہ ہم نشینی میرے لئے کتنے ہی انعامات لے کر آتی ہے۔ کوئی نازک جذبہ، کوئی فکر جو افقِ زیست کو منوّر کرے، کوئی آنسو، ہونٹوں پہ تبسّم۔

پروفیسر صفدر حسین صفدؔر صاحب نے اپنی نظم کا عنوان "آشوبِ میکدہ" رکھّا جو حیات و کائنات کی علامت یا استعارہ معلوم ہوتا ہے۔ میرے نزدیک یہ نظم داستانِ آدم ہے اور اس داستان میں آدمی کی انسانیت اور تاریخ کائنات میں مسلمان کے مرتبہ، امکانات اور فرائض کی نشاندہی بھی ہے۔

اپنے فارم کے اعتبار سے بھی یہ نظم ایک تجربہ ہے۔ اس کا آہنگ اور بحر مثنوی کی ہے، اور پھر اس میں مثنوی کی ایک شکل ساقی نامے کا انداز بھی ہے پھر یہ نظم "مربع" بھی ہے۔ آگے بڑھ کر چار مصرعوں کے قوافی کا اہتمام ختم ہوگیا۔ نظم کے بعض حصے مسدس کے فارم میں ہیں ایک ہی نظم میں ہیئت کی یہ مختلف شکلیں اس بات کا اظہار ہیں کہ اپنے معانی و مطالب شاعر کو زیادہ عزیز ہیں۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ نظم کے ارتقاء کے ساتھ اس کے پیکر میں فطری طور پر تبدیلیاں آتی چلی گئیں۔ یہ تکنیک اردو کی بعض اور طویل نظموں میں بھی ملتی ہے۔ لیکن اپنے پھیلاؤ اور فکری وسعت کے اعتبار سے یہ نظم دوسروں سے مختلف ہے۔

اس نظم پر اقباؔل کے اثرات واضح ہیں اور اقباؔل ہی کی طرح پروفیسر صفدر حسین صفدؔر مشرق و مغرب کے درمیان خط نہیں کھینچتے۔ وہ ایک مسلمان کی حیثیت سے اپنے رسولؐ کے اس قول کو اپناتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ حکمت مومن کی گمشدہ میراث ہے جہاں سے ملے اسے لے لو۔

یہ نظم تاریخ کا منظر نامہ (PANORAMA) اور سیر بین ہے۔ اس کی ترتیب روایتی زمانی و مکانی ترتیب نہیں بلکہ شاعر کی ترتیبِ ذہنی اور موضوعات کے تحت ہے۔ یہاں سقراط، حلّاج، ژاں پال سارتر (سارتر)، برناڈ شاہ، کانٹ سب ہم عصر ہیں۔ فلسفی شاعر کا یہ بھی کمال ہے۔

اس طویل نظم کو وہ فانوس کہئے جو رقص کرتا تھا تو مختلف تصویریں ابھر آتی تھیں۔ اس میں عظیم فلسفیوں کے ساتھ ساتھ پاکستان کے اردو ادیبوں، شاعروں اور سیاستدانوں کے بارے میں پروفیسر صفدر حسین صفدؔر کے خیالات سلیقے سے نظم ہوئے ہیں ان کی بہت سی آراء سے مجھے اختلاف ہے بعض واقعاتی غلطیاں بھی ہیں مثلاً" بھٹو مرحوم کو اسلامک سمٹ (Islamic Summit) کا بانی قرار دینا۔ اسلامی سربراہ کانفرنسوں کا آغاز پہلے ہی ہوچکا تھا بہر حال مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ اس وسعت کو ہمارے ایک شاعر نے اختیار کیا ہے۔

ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی

پروفیسر شعبہ اردو، کراچی یونیورسٹی، کراچی

26۔ اگست 1992ء

پروفیسر ڈاکٹر صفدر حسین صفدرؔ

"آشوبِ میکدہ"

ہمارے روایتی معاشرے میں "میکدہ" ایک ادارہ تھا جس میں جلب مُسرّت اور لذّت اندوزی کے دلدادے اپنی باطنی اذیّت سے غافل ہونے کے لئے کیف و سرور کے ذریعے آسودگی محسوس کرتے تھے اور "آشوب" وہ بے نظامی تھی جو کیف و سرور کو درہم برہم کرتی تھی۔

عزیزِ گرامی مصنّف ڈاکٹر صفدر حسین صفدر نے یہ دو اصطلاحیں لغوی معنی میں نہیں استعارۃً" استعمال کی ہیں۔ جس میں "میکدہ" ان کے نزدیک یہ سارا عالم ہے اور "آشوب" وہ ساری بے نظامی ہے جس کی بدولت حصولِ کمال کی آرزوئیں جو بے نظامی کے باعث پامال ہوتی ہیں اور یہ ایک ایسی آرزو کے پورا ہونے میں رکاوٹ سے بے زاری ہی وہ محرک ہے جس نے ہزارہا اشعار کی شکل اختیار کی ہے جس کا محرّک طلب کمال سے ساز گار ماحول کی آرزو ہے جس نے یہ اشعار کہلوائے ہیں جس شدّت سے مصنّف نے اذیّت محسوس کی ہے۔ شاید ہی ایسا کوئی فرد میسّر آئے جو مصنّف کا ہم نوا نہ ہو۔ اللہ پاک عزیزِ گرامی ڈاکٹر صفدر حسین صفدرؔ کی آرزو سے سازگار ماحول پیدا فرما دے۔

دعا گو
ڈاکٹر برہان احمد فاروقی